جھنگ کی لوک کہانیاں

چناب و جہلم کے سنگم کی عوامی داستانیں

*

بلال زبیری

*

نام کتاب —— جھنگ کی لوک کہانی

مصنف —— بلال زبیری

ناشر —— اقبال زبیری

صفحات —— ۱۶۰

مطبع —— القائم پریس لاہور

اشاعت اول —— نومبر ۱۹۷۴ء

اشاعت دوم —— اپریل ۱۹۷۵ء

قیمت —— ۶ روپے

کاتب —— عبدالوحید

ملنے کا پتہ

جھنگ ادبی اکیڈمی جھنگ



بلال زبیری

انتساب

اپنی بیٹی

حمیرا خانم

کے نام

نیک تمناؤں کے ساتھ

بلال زبیری

۱۴ر اگست ۱۹۷۴ء

جھنگ کی لوک کہانیاں

ترتیب

اشاعت ثانی

جس کا پہلا ایڈیشن طباعت اور کتابت کے اعتبار سے انتہائی ناقص تھا۔ کاغذ کی گرانی اور دوسرے حالات نے مجھے گنجائش نہ دی کہ اسے بہتر شائع کر سکتا مگر اس کے باوجود پہلا ایڈیشن صرف تین ماہ کی مدت میں ختم ہو گیا، اشاعت ثانی میں ناسازگار حالات کے باعث مسلسل تاخیر ہوتی رہی، قارئین کو صبر آزما انتظار سے گزرنا پڑا، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اشاعت ثانی کا مرحلہ طے ہوا۔

کتاب پیش خدمت ہے مندرجات میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی البتہ اشاعت اول میں کتابت کی جو غلطیاں ہوئی تھیں ان کو درست کر دیا ہے، مجھے یقین ہے کہ میری یہ کوشش اردو ادب لٹریچر میں حسین اضافہ سے تعبیر ہو گی

بلال زبیری

حرفِ اوّل

*

جھنگ کی لوک کہانیاں، اس تاریخ ساز خطہ کی عظمتِ رفتہ کے علامتی نشان ہیں، جھنگ معاشی اقتصادی سیاسی اور سماجی اعتبار سے پسماندہ ہی سہی لیکن اس کی گود میں حسن و عشق، جراَت و شجاعت، اخلاق و عرفان، عظمت و رفعت کی ایسی داستانیں موجود ہیں جن سے اس کا ثقافتی ماضی آفتاب کی طرح روشن ہے۔ یہ کہانیاں اپنے وجود میں ہزاروں کہانیوں کے عنوان رکھتی ہیں ان کے ہر کردار میں ایک تاثر، فعالیت اور معنویت موجود ہے ان لوک کہانیوں سے ہماری تہذیب، زبان، رسم و رواج اور لوک گیت پرورش پاتے ہیں۔ دیہی زندگی کے شب و روز انہی سے عبارت ہیں، شہری زندگی جو مشینوں سے متاثر ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود عظمتِ رفتہ کے ان قصوں سے ابھی خالی نہیں ہوئی، آج بھی جہاں چوپال جمتی ہے یہی قصے کہانیاں ان کا موضوع بنتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر انہی کہانیوں

سے اخذ شدہ گیت، ماہیے، ڈھولے اور رزمیہ بول فضا میں ہلچل مچاتے اور ڈھولک کی تھاپ پر اچھالے جاتے ہیں۔ یہی کہانیاں ہماری تہذیب کا سرمایہ اور لسانی دولت ہیں۔ ہماری تاریخ کے محفوظ بنک ہیں ہماری عظمت ماضی کے امین ہیں ان میں حسن و عشق کی حقیقی اور فرضی داستانیں بھی موجود ہیں ان میں دنیا کی بے ثباتی۔ ماں کی ممتا۔ باپ کی شفقت کے قرینے بھی ملتے ہیں۔ بے وفائی اور جفاکشی کی تلخیاں بھی ہیں۔ جرأت و بہادری کے عنوان بھی تہی دستی و حکمرانی کے واقعات بھی اور غیرت ملی کے کارنامے بھی، ہر قوم کی تاریخ ان ہی واقعات سے عبارت ہوتی ہے اور کسی بھی خطہ کا ماضی ان سے تہی دامان نہیں ہوتا یہ الگ بات ہے کہ ہر خطہ اور قوم کا مزاج چونکہ جدا ہوتا ہے لہذا ان کی کہانیوں کا انداز بھی دوسروں سے مختلف! لیکن ہر کہانی میں ایک ہی جذبہ یکساں ملتا ہے اور وہ ہے کردار، خواہ اس کی زبان اور انداز بیان میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔

داستان گوئی کی طرح داستان نویسی بھی ایک مستقل فن ہے اس کی اپنی حد بندیاں ہیں اس کا اپنا مزاج اور اس کا اپنا ایک انداز ہے لیکن داستان گوئی اور داستان نویسی میں ایک نمایاں فرق ہے۔ داستان گو اپنی زبان کے لب و لہجہ سے اس میں چاشنی کشش اور حسن پیدا کرتا ہے۔ لہذا داستان نویس کو قلم کے ذریعہ وہی تاثر پیدا کرنا پڑتا ہے جو داستان گو کے لئے مخصوص ہے اس مقصد کے لئے لکھنے والے کا قلم، دماغ اور فکر اس تمام ماحول پر حاوی ہونا چاہیئے جس ماحول کو وہ قلمبند کر رہا ہے۔ بلاشبہ یہ انتہائی مشکل کام ہے کہانی کا انتخاب پہلا مرحلہ ہے پھر اس کے سیاق و سباق کی کڑیاں۔ تاریخ کی تطبیق اور معاشرتی علامتوں کا امتزاج۔ کرداروں کی لسانی اہمیت۔ زمان و مکان کی حد بندیاں۔ استعاروں۔ تشبیہوں، محاوروں اور روزمرہ سے ان کے حسن کو نکھارنے کی سعی! یہ تمام مراحل مشکل ترین ہوتے ہیں کیونکہ داستان نویسی میں مقام و مکان کردار وغیرہ حقیقی ہوتے ہیں۔ اور حقیقت کے ان تمام پہلوؤں کو لکھتے وقت سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بعض

لوگ داستان نویسی کرتے وقت افسانوی انداز اختیار کر لیتے ہیں جس سے ممکن ہے بیان کا چٹخارہ تو بڑھ جاتا ہو گا مگر داستان کی حقیقت و معنویت اپنی جگہ پر بہ حسن و کمال قائم نہیں رہ سکتی۔ فنی اعتبار سے بھی داستان نویسی اور افسانہ نویسی کے درمیان نمایاں فرق ہے لہٰذا ان دونوں کو خلط ملط کرنے سے وہ حسن قائم نہیں رہتا جو داستان نویسی کا لازمہ ہے۔

میں نے اسی لئے افسانوی زبان سے گریز کیا ہے نہایت سادہ زبان میں داستان کے مختلف کرداروں اور کڑیوں کے درمیان تسلسل قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس بارے میں خود کوئی بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں کہ فنی اعتبار سے میری یہ کوشش کامیاب ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ نقادان فن اور قاری ہی کر سکتے ہیں البتہ کہانیوں کے انتخاب میں میں نے یہ احتیاط ضرور اختیار کی کہ صرف انہیں شامل کتاب کیا جن کے تاریخی اور قلمی ماخذ مجھے ملے اور جن کی شہرت و عرفیت سے جھنگ کا گوشہ گوشہ گونجتا ہے۔ اس مجموعہ میں ہیر رانجھا ایسی فرضی داستان بھی شامل ہے اور مرزا صاحباں ایسی حقیقی کہانی بھی، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین کے کارنامے اور نواب طاہرہ بیگم کی وفاداری بھی، ہر کہانی اپنی جگہ پر اپنے موضوع کے اعتبار سے مکمل ہے البتہ بعض جگہ مجھے اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔ میں نے ان داستانوں کی صرف عرفیت عامہ ہی کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ بعض ایسے اہم مقدمات کی کہانیاں بھی شامل کی ہیں جن کا کسی زمانہ میں خوب چرچا تھا اور آج بھی گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را کے مصداق میلوں ٹھیلوں اور مجلسوں میں ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ نواب محمد نواز ڈب اور شمشاد رقاصہ یا شانتی اور نابو کی کہانی، جیسے محرم مالک کی لوٹی کے معرکہ انگیز واقعات وغیرہ، اس کے علاوہ جھنگ کی ریاستی سیاست کے اتار چڑھاؤ اور تاریخی تبدیلیوں سے وابستہ بعض اہم واقعات بھی میں نے منتخب کئے ہیں جو ہماری تاریخ کا سرمایہ ہیں جیسے فتح بی بی اور سردار مہاں سنگھ کا واقعہ۔

ان کہانیوں کے انتخاب اور ان کے کرداروں کے بارے میں حقیقی واقعات کی چھان بین

کے لئے میں نے حتی الوسیع کوشش کی ہے کہ ان کے تاریخی ماخذ میسر آئیں یا مقدمات کے اصل ریکارڈ سے اخذ کروں اس سلسلہ میں میاں نور محمد چیلہ کی کتاب "تاریخ جھنگ سیال" کے علاوہ مقدمات کے سرکاری ریکارڈ۔ موقع کے گواہوں۔ مدعی۔ مدعا علیہ کی زبانی تفصیلات سے بھی مدد حاصل کی ہے بعض دیگر کتب جن میں ضمناً یا صراحتاً تذکرہ موجود تھا، سے بھی استفادہ حاصل کیا اس طرح جھنگ کی رومانی اور ثقافتی تاریخ مرتب ہوئی۔ میں اسے حرف آخر نہیں کہہ سکتا کیونکہ تحقیق کی دنیا میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "تذکرہ ادبائے جھنگ" کے دیباچہ میں عرض کیا تھا کہ یہ کتاب منزل کا تعین کرتی ہے حرف آخر نہیں البتہ آنے والا مورخ مذکورہ کتاب کے بغیر اپنے قدم آگے بڑھانے کا حوصلہ نہیں پا سکے گا۔ اسی طرح "جھنگ کی لوک کہانیاں" یہ کتاب بھی نشان منزل ہے منتہا رمنزل نہیں۔ لیکن آئندہ کوئی مورخ یا ادیب اس سے استفادہ کئے بغیر قدم بڑھانے کے قابل نہیں ہوگا۔

ایک بات اور بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب ضلع کی لوک کہانیوں کی مکمل نمائندگی نہیں کرتی اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مشہور کہانیوں اور واقعات کی مصدقہ کڑیاں تلاش کرنے میں مجھے ناکامی ہوئی لہٰذا نامکمل واقعات کو اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کہانیاں کسی خاص علاقہ میں مشہور ہونگی مگر میں ان تک رسائی حاصل کرنے سے محروم رہا اس صورت میں کتاب کے قارئین سے التماس ہے کہ وہ مجھے آگاہ کریں تاکہ آئندہ اشاعت میں انہیں بھی شامل کیا جا سکے میں کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی، طباعتی اخراجات میں ہوشربا اضافہ، تحقیق کی نامساعد منزلیں طے کر کے اسے شائع کر رہا ہوں فیصلہ قارئین کے ہاتھ ہے۔

بلال زبیری

عرضِ ناشر

*

بلال زبیری صاحب کی شخصیت اردو علم و ادب، تاریخ و صحافت، تمدن و سیاست کے میدان میں کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں۔ موصوف نے جھنگ ایسے پسماندہ خطہ میں جہاں تحقیق کی سہولتیں عنقا اور علمی ذوق کا فقدان ہے جہاں کوئی دارالمطالعہ نہیں۔ کوئی معقول پبلک لائبریری نہیں۔ قدیم کتب کا کہیں نشان نہیں ملتا اور اس مستزاد معاشی و اقتصادی ناہمواری جو موصوف کی زندگی کا جزو لازمہ بنی ہوئی ہے ان مشکلات کے باوصف اور نامساعد حالات کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ بلال زبیری صاحب کا حوصلہ۔ عزم غیر متزلزل اور تصنیف و تالیف سے لگن ہی ان کو تحقیق کے لق و دق صحراؤں پہاڑوں۔ جنگلوں اور دریا سمندروں میں لئے پھر رہی ہے۔

اہل جھنگ ان کی شخصیت کو کسی بھی پہلو اور رُخ سے دیکھیں ہر طرح سے اُن کی شخصیت منفرد اور ان کا ادبی و سیاسی قد و قامت دوسرے اہل قلم سے نمایاں ہے ورنہ

جھنگ کے تاریخ ساز خطہ میں لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ نامور شاعر موجود ہیں لیکن ان کی کاوشیں ایک آدھ مجموعۂ کلام سے آگے نہیں بڑھ سکیں اور نثر کے میدان میں تو جناب بلال زبیری کے علاوہ کوئی شخصیت نہ ابھر سکی۔ جس نے محدود وسائل۔ نامساعد حالات اور شدید ترین مشکلات میں تصنیف و تالیف کا کٹھن سلسلہ شروع کیا۔ موصوف کی دس کتابیں مختلف موضوعات پر چھپ چکی ہیں۔ ان میں تاریخ۔ تصوّف۔ سوانح۔ ادب افسانوی ادب۔ سیاست و معاشیات۔ رومان اور علاقائی ثقافت کے موضوعات شامل ہیں۔ بعض کتب کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

بلال زبیری کی تازہ تصنیف "اسلامی حکومت اور سوشلزم" کو بے پناہ عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کتاب کے بیشتر مضامین اردو کے علاوہ انگریزی۔ فارسی اور عربی میں ترجمہ ہو کر ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوئے۔ مختلف بیرونی ممالک کی ریڈیو نشریات کا جزو بنے۔

بلال زبیری کی ایک اور معرکتہ الآرا تصنیف "فرقے اور مسالک" نے علمی دنیا میں ہیجان اور تجسس پیدا کر دیا۔ یہ کتاب مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کا تجزیہ ہے اس میں تین سو سے زائد فرقوں کے حالات و افکار۔ عقائد و نظریات کا غیر جانبدارانہ تعارف کرایا گیا ہے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

جھنگ ادبی اکیڈمی جو کاروباری نہیں محض اشاعتی ادارہ ہے کو اس بات پر فخر ہے کہ اس کی نگرانی میں قیمتی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ہم اہلِ ذوق سے معاونت کے طلب گار ہیں تاکہ بلال زبیری کی دیگر کتابیں اسی ذوق و شوق سے شائع کرتے رہیں۔

قیصر مصطفٰے زبیری



ہیر رانجھا

۸۳۰ ہجری

وادیٔ چناب کے یہ دو نام عشقیہ کہانی کا حصہ اور پنجابی ادب عالیہ کا سرمایہ بن چکے ہیں۔ ہیر رانجھا کی مروجہ کہانی جسے وارث شاہ اور دیگر شعراء کرام نے بیان کیا، کے مطابق ہیر جھنگ کے نواب سیال خاندان کے ایک شخص چوچک کی لڑکی تھی جس کے حسن و جمال کا شہرہ چار دانگ عالم پھیل چکا تھا۔ قصبہ تخت ہزارہ ضلع سرگودھا کے ایک شخص رانجھا نامی جو مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ ہیر کے حسن کی غائبانہ شہرت سے متاثر ہوا اور ہیر کے خیال میں غلطاں رہنے لگا۔ رانجھا کی بھاوج نے ایک دن اسے طعنہ دیا کہ کمائی نہیں کرتا مگر روٹی کے وقت ہزار حجتیں بناتا ہے تم نوابی چھوڑ دو، ورنہ جھنگ کی ہیر سیال کے پاس چلا جا وہی اب تمہاری روٹی پکائے گی۔ گھی سے گوندھی ہوئی روٹیاں اسی کی کھانا۔ رانجھا اپنی چار بھاوجوں کا طعنہ سن کر جھنگ کی طرف چل دیا۔ جنگل بیلے میں سفر کرتا ہوا جب جھنگ کے پاس چناب کے کنارے پہنچا تو ایک آراستہ کشتی دیکھی جس میں پھولوں کی چادریں بچھی ہوئی تھیں مگر اس میں کوئی آدمی موجود نہ تھا رانجھا تھکا ہوا تھا وہ کشتی میں داخل ہو کر گھنی چھاؤں کے شرمیلے نشے میں مست سو گیا۔ پچھلے پہر ہیر اپنی سہیلیوں کے ہمراہ آئی اس نے کشتی میں اجنبی کو سویا ہوا دیکھا تو اس کی نوابی حس بھڑک اٹھی اس کی غیرت بیدار ہوئی۔ اس نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کشتی میں داخل ہو کر رانجھا کو نیند سے جگا دیا اور اسے سخت سرزنش کی اس دوران رانجھا نے ہیر کی طرف دیکھا اور ہیر نے اس کی طرف

دونوں کی نگاہیں ملیں اور پھر جھک گئیں، کہاں ہیر اس اجنبی پر سخت خفا تھی مگر نظریں ملنے کے بعد اس کا انداز انتہائی نرم ہو گیا۔ یہ پہلی ملاقات دونوں کے درمیان مستقل عشق کی بنیاد بن گئی۔ رفتہ رفتہ دونوں قریب ہو گئے۔ چوچک نے ہیر کی سفارش پر اسے بھینسیں چرانے کیلئے ملازم رکھ لیا۔ رانجھا ہیر کی بھینسیں لے کر جنگل بیلے جاتا اور ہیر گھی میں گوندھی ہوئی روٹیاں لے کر اسے پہنچاتی۔ دونوں میں پیار اس قدر بڑھا کہ ایک دوسرے میں فنا ہو گئے۔ ہیر کا چچا کیدو لنگڑا دونوں کے پیار و محبت سے آگاہ ہو چکا تھا اس نے چوچک سے کہا۔ ہیر رانجھا کے ساتھ پھنس کر اپنی اور خاندان کی عزت خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے لہٰذا رانجھا کو یہاں سے نکال دو۔ چوچک نے پہلے کئی روز تک کیدو کی بات نہ مانی۔ پھر کیدو ایک دن چوچک کو لے گیا اور جنگل بیلے میں دونوں کی ملاقاتوں کا مشاہدہ کرایا۔ چوچک نے گھر واپس آکر رانجھا کو ملازمت سے ہٹا دیا اور ہیر کا رشتہ سید و قوم کھیڑا ساکن رنگ پور سے طے کر دیا۔ ادھر ہیر و رانجھا کی یہ حالت تھی جو رانجھا کی بھینسیں برداشت نہیں تھیں۔ رانجھا کی جدائی میں اداس ہو گئیں اور رانجھا نے بھی دودھ دینا بند کر دیا دوسری طرف رانجھا ہیر کے لئے بے قرار رہنے لگا ہیر اپنے گھر میں مضطرب تھی۔ ہیر کا نکاح سید و کھیڑے سے کر دیا گیا وہ ہیر کی ڈولی لے کر رنگ پور چلا گیا مگر وہ رانجھا کے لئے اداس و پریشان رہنے لگی۔ اس نے سید کھیڑے کو اپنا خاوند تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہیر کو یہاں ایک رازدار سہیلی سہتی جو اس کی نند بھی تھی سے ملاقات کر کے بڑی تقویت ملی۔ سہتی بھی ایک شخص مراد سے محبت کرتی تھی مگر ان دونوں کے درمیان بھی دیوار حائل تھی۔ رانجھا ہیر سے ملاقات کے لئے بے قرار تھا اس نے ایک ہندو بال ناتھ کو اپنا مرشد بنایا اور اس کے مشورہ سے سادھو بن گیا۔ کان چھدوائے اور جوگی بن کر بھیس بدل کر رنگ پور پہنچا اور سید و کھیڑے کے مکان پر صدا لگائی۔ کھیڑوں کی عورتیں جن میں ہیر اور سہتی بھی شامل تھیں۔ سادھو کو خیرات دینے باہر نکلیں۔ ہیر نے رانجھا کو پہچان لیا اور رانجھا نے اپنا مقصود دیکھ لیا۔ رانجھا نے رنگ پور

میں ڈیرہ لگا لیا اور خیرات کے بہانے ہیر کا دیدار کرتا رہا۔ بالآخر ہیر نے سہتی کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا جس کے مطابق ہیر کو سانپ نے ڈس لیا جب ہیر بے ہوش ہوگئی تو اس نے کہا کہ اس زہریلے سانپ کے ڈسے کا علاج اس سادھو کے پاس ہے جو کئی دنوں سے رنگ پور کے باہر ڈیرہ لگائے بیٹھا ہے اسے بلاؤ۔ سادھو بلایا گیا۔ ہیر اور رانجھا کو ایک کمرہ میں بند کر دیا گیا تاکہ سادھو منتروں کے ذریعے ہیر کو صحت یاب کرے چنانچہ سہتی نے کمرہ کی دیوار میں نقب لگائی۔ ہیر رانجھا دونوں بھاگ گئے۔ سہتی بھاگ کر مراد کے پاس پہنچ گئی۔

یہاں تک تمام داستان گو یا شاعر قریباً متفق ہیں۔ بعض جزدیات میں اختلاف ہے مگر اس کے بعد کے واقعات میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کہ رانجھا کو کھیڑوں نے جنگل میں پکڑ کر مار دیا تھا۔ بعض کہتے ہیں دونوں کو قتل کر دیا تھا کچھ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دونوں جب جھنگ کے قریب پہنچے تو سیالوں نے ان کو قتل کر دیا۔ کچھ داستان نویسوں نے یوں لکھا کہ رانجھا کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ہیر اپنے محل میں چلی گئی جہاں سے اس کی لاش ملی بہر حال ہیر اور رانجھا کی کہانی کے اختتام پر اختلاف موجود ہے لیکن کہانی کے ابتدائی حصے اکثر و بیشتر شعراء نے ایک جیسے بیان کئے ہیں۔ وارث شاہ اور دیگر شعراء کے بیان کردہ واقعات کا اختصار یہ ہے لیکن جہاں تک اس داستان کا میں نے جائزہ لیا ہے اور تاریخی اعتبار سے واقعات کی تحقیق کی ہے مجھے مروجہ کہانی محض شاعرانہ تعلی نظر آتی ہے۔

شاعر جذبات کا نمائندہ ہوتا ہے مگر مورخ واقعات کی بنیادی کڑیاں تلاش کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے شاعر اور مورخ کی سوچ کے دھارے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ ہیر لکھنے والے اکثر شعراء نے اپنے ہی عہد کے حالات ہیر کے عہد پہ چسپاں کر دیئے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے قطعی مختلف ہے۔ بعض لوگوں نے میرے بارے میں یہ مشہور کر دیا کہ میں نے سیالوں کی اس معاملہ میں صفائی پیش کرنے کے لئے مروجہ واقعات کی نفی کی ہے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے اگر مجھے صفائی مطلوب ہوتی تو پھر مرزا صاحباں کی

داستان کا تعلق بھی سیالوں ہی سے ہے اس کی صفائی بھی دی جا سکتی تھی لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ مرزا صاحباں واقعتاً عشقیہ کردار تھے مگر ہیر رانجھا کو محض عشقیہ کہانی میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔ مفروضوں پر عمارت کھڑی کر دی گئی ہے اور اسے اس انداز سے پھیلایا کہ آج وہ حقیقت نظر آتی ہے مگر جس طرح ہر چمکتی شے سونا نہیں ہو سکتی اسی طرح ہر واقعہ خواہ وہ صدیوں سے کیسا ہی مشہور کیوں نہ ہو، اس کی عرفیت و معنویت کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

میرے پاس اس کے لئے ٹھوس دلائل اور تاریخی واقعات ہیں۔ میں دلائل سے بات کرتا ہوں زبانی روائتوں کا سہارا نہیں لیتا خواہ ان روائتوں میں کتنی ہی کشش کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں میری پہلی دلیل یہ ہے کہ ہیر نواب بہلول لودھی کے عہد میں ہوئی۔ ہیر کی ابتدائی بلکہ جوانی کی عمر تک سیال جھنگ کے نواب یا حکمران نہیں تھے بلکہ ہیر کی زندگی کے آخری چند سالوں میں اس کا چچازاد بھائی مل خان جو پہلے کچھی کا زمیندار تھا فاتحانہ طور پر جھنگ میں داخل ہوا اور اس نے نول قوم کے حکمران ولی داد کو شکست دے کر جھنگ پر قبضہ کیا اس زمانے میں نول حکمران کمالیہ کے کھرل نوابوں کے تابع تھے۔ سیالوں اور کھرلوں کے درمیان رنجش کا آغاز اسی واقعہ سے ہوا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ شعرا نے ہیر اور رانجھا کی ملاقاتیں چناب کے مشرقی کنارے جھنگ کے قریب بیان کی ہیں حالانکہ ہیر کوٹلی باقر میں پیدا ہوئی وہیں پلی بڑھی، پروان چڑھی اور زندگی کے آخری دن تک اسی قصبہ میں رہی۔ کوٹلی باقر جہلم کے دوسرے کنارے پر واقع ہے اور جھنگ سے کم از کم چالیس کوس دور، درمیان میں چناب اور جہلم دو دریا پڑتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہیر رانجھا روزانہ دو دریا عبور کر کے ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے تھے گویا اسی کوس کا فاصلہ روزانہ طے کرتے یہ بات واقعتاً غلط اور اور ناقابل تسلیم ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ شعراء نے ہیر کے نوابانہ ٹھاٹھ باٹھ کا ذکر کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے اس لئے غلط ہے کہ وہ معمولی زمیندار کی لڑکی تھی۔ چوچک کو نواب بہلول نے کچھ اراضی عطا کی تھی جو اس کی گزر بسر کے لئے تھی اس کا دستاویزی ثبوت انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ مخطوطات سے لیا جا سکتا ہے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ اگر ہیر اور رانجھا عشقیہ کردار ہوتے تو کم از کم حضرت شاہ حسینؒ بابا بلھے شاہ۔ حضرت سلطان باہوؒ۔ خواجہ فریدؒ ایسے صوفی شعراء ان کا تذکرہ عارفوں اور ولیوں کی طرح نہ کرتے اور نہ ہی ہیر رانجھا کو شہرت ملتی۔ ان صوفی شعراء نے ہیر رانجھا کے عشقیہ کردار کو نہیں پیش کیا بلکہ مجاز کے لباس میں عشق حقیقی کی منازل سے آگاہ کیا ہے حتیٰ کہ خود وارث شاہ صاحب اپنی ہیر کے آخر میں اعتراف کرتے ہیں کہ ہیر رانجھا کی داستان حقیقی نہیں بلکہ اس کے تمام کردار فرضی ہیں اور بطور استعارہ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ سید محمد وارث شاہ نے اپنی ہیر میں "شاعر دی نصیحت" کا عنوان دے کر جو کچھ اس ایک صفحہ پر لکھا ہے اس سے تمام داستان از خود فرضی بن جاتی ہے۔

الغرض دلائل کے علاوہ جب تاریخی واقعات کا تجزیہ سامنے آتا ہے تو از خود قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ شعراء نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی۔ یہ سوچے کہ شعراء نے "یوسف زلیخا" کو ایک عشقیہ داستان بنا دیا حالانکہ حضرت یوسف پیغمبر تھے اور عصمت انبیا کا عقیدہ مسلمان کے لئے جزو ایمان ہے مگر شعراء کرام نے نبی کی عصمت کا بھی خیال نہ کیا اور اپنی ترنگ میں "یوسف زلیخا" ایسے انداز میں لکھی کہ وہ سسی پنوں سوہنی مہینوال۔ لیلےٰ مجنوں۔ مرزا صاحباں قسم کی داستان بن کر رہ گئی ہے۔

اس سلسلہ میں جب میں نے تحقیق کی کہ قرآن مجید نے تو صرف عزیز مصر کی بیوی کے عنوان سے حضرت یوسف کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ عزیز مصر کی بیوی کا نام شعراء کو کہاں سے ملا جبکہ تورات، انجیل اور قرآن مجید نے کسی جگہ لفظ زلیخا

کی نشاندہی نہیں کی۔ مفسرین قدیم اور محدثین نے اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی
مولانا جامی قسم کے ثقہ بزرگوں نے "زلیخا" نام کہاں سے تلاش کر لیا اور پنجابی شعراء کا ماخذ
کیا ہے تو مجھے کسی جگہ سے اس کی سند نہ مل سکی البتہ جب عربی لغت میں لفظ "زلیخا"
کا مصدر دیکھا تو بڑا تعجب ہوا کہ یار لوگ کس طرح نالے کو رسا باندھتے ہیں۔

لفظ زلیخا کا مصدر ہے "زلخ" عربی میں زلخ کہتے ہیں ایسی چمکتی چیز کو جسے دیکھتے ہی آنکھیں چندھیا جائیں۔ چونکہ شعراء نے عزیز مصر کی بیوی کے حسن کو کلائمکس تک پہنچانا تھا لہذا انہوں نے "زلخ" سے لفظ زلیخا وضع کر لیا اور داستان مرتب کر ڈالی، اور فرضی زلیخا حضرت یوسف کے ساتھ نتھی کر دی گئی۔ شعراء نے عصمت انبیاء کی بھی اپنی لگن میں پرواہ نہ کی۔ ہیر اور رانجھا کا درجہ تو بہت بعد کا ہے۔ پھر شعراء کرام ہیر کی داستان میں نہ ہیر کے اصل نام سے آگاہ ہو سکے اور نہ رانجھا کے نام سے، جبکہ ان کے یہ نام حقیقی نہیں ہیں مگر شعراء نے عرفیت کا سہارا لیا۔ عزت بی بی ہیر بن گئی اور مراد بخش رانجھا مشہور ہو گیا۔ اب میں لفظ ہیر کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

ہیر کے تین معنی ہیں۔ اول عابدہ، زاہدہ۔ دوم عارفہ۔ سوم ہیرے کا گول ٹکڑا۔ مزید تفصیلات کے لئے فیروز اللغات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ہیر کا اصل نام عزت بی بی تھا اور یہ نام حضرت مخدوم سید کبیر بخاری نے تجویز کیا تھا جو عارف باللہ تھے اور ہیر کے روحانی مقام سے واقف تھے۔ اسی طرح رانجھا نام نہیں بلکہ رانجھا ایک گوت یا ذات ہے اس کا حقیقی نام مراد بخش تھا اور وہ اپنی ذات کی وجہ سے رانجھا مشہور ہوا۔ عزت بی بی اپنے عہد کی عارفہ تھی۔ نواب بہلول لودھی بھی سادات بخاری کی وجہ سے اس کا عقیدت مند تھا اور اسی عقیدت کی بنا پر نواب بہلول نے عزت بی بی کے والد چوچک کو گھی میں جاگیر عطا کی تھی چونکہ چوچک اولاد نرینہ سے محروم تھا اس نے اپنی جاگیر کا وارث مل خاں کو بنا دیا جو اس کا حقیقی بھتیجہ تھا۔ یہی شخص سیالوں میں پہلا حکمران بنا اور نواب بہلول نے اسے

خانی کا خطاب عطا کیا ورنہ اس سے قبل یہ خاندان حکمران نہیں تھا۔ خدا جانے شعراء نے ہیر کے چار بھائی کہاں سے تلاش کئے اور چچا کیدو کہاں ان کو دستیاب ہوا۔ اس کا کوئی تاریخی ماخذ نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہیر کی مروجہ داستان کو فروغ کیونکر ملا اور اس کے عوامل کیا تھے، اس بارے میں نواب بہلول کا وہ خط ایک تاریخی سچائی کی حیثیت رکھتا ہے جو اس نے نول قوم کے وفد کی گفتگو سننے کے بعد مل خان کو لکھا تھا۔ نول حکومت سے محروم ہو جانے کے بعد کھرلوں سے مل کر مل خان کے خلاف سازشیں کرنے لگے تھے انہوں نے اپنے سرکردہ افراد پر مشتمل ایک وفد مرتب کیا جو نواب بہلول حاکم لاہور سے ملا اپنی صفائی اور بے گناہی پیش کرنے کے علاوہ مل خان کی خاندانی شہرت و شرافت کو داغدار بنا کر پیش کیا۔ پہلی بار چوچک کی لڑکی ہیر کے بارے میں یہ مفروضہ کہانی سنائی کہ وہ ولی اللہ نہیں بلکہ وہ اپنے ہی ملازم رانجھا سے بگڑی ہوئی ہے اور اس کا چال چلن ٹھیک نہیں حاکم لاہور نے حکومت کے اختیارات ایسے خاندان کے افراد کو دے دیئے ہیں جن کی اخلاقی شہرت اچھی نہیں۔ نواب بہلول نے ہیر کے بارے میں وفد کی باتیں سنی اور ان کو جھڑک کر دربار سے نکال دیا پھر نواب بہلول نے اپنے قاصد کے ذریعہ مل خان کو وفد کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ جس میں نواب بہلول نے لکھا کہ نولوں کے وفد نے میرے پاس آ کر ہیر کے بارے میں غلط باتیں کی تھیں میں نے ان کو دربار سے نکال دیا ہے انہوں نے ایک ولی اور عارفہ پر تہمت لگائی ہے جو میری نگاہ میں جرم ہے۔ میں جھنگ کی حکومت کے بارے اب نولوں کا نام بھی برداشت نہیں کرتا۔ مزید مل خان کو لکھا کہ رعایا سے اچھا سلوک کرو تاکہ وہ تمہاری وفادار بن جائے۔ نولوں نے لاہور سے ناکام ہونے کے بعد اپنے پرانے درباری بھاٹوں اور ہجوگو مراثیوں کے ذریعہ مل خان کو بدنام کرنے کیلئے ہیر رانجھا کی مفروضہ کہانی پھیلائی جو پھیلتے پھیلتے آج ایک مستقل داستان بن چکی ہے اور اس پر شعراء نے بلا تحقیق خیالات کی بلند و بالا عمارتیں تعمیر کر لی ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ بالفرض ہیر رانجھا کا واقعہ غلط ہے تو یہ رانجھا کون تھا؟ اس کی سیالوں کے ہاں کیا حیثیت تھی اور صرف اسی کو لوگوں نے ہیر سے کیوں منسوب کیا جبکہ ان کے ہاں اور بھی کوئی ملازم ہوگا۔ کسی دوسرے کا نام کیوں نہ لیا گیا۔

یہ سوال واقعی اہم ہے اس کا جواب بھی تاریخی حوالوں سے عرض خدمت ہے۔

مخدوم سید کبیر جو سیالوں کے مرشد تھے ۸۲۸ھ میں چوچک سیال کے ہاں پہنچے چوچک اولاد سے محروم تھا اس نے مرشد سے اولاد کے لئے دعا کرنے کی فرمائش کی۔ مخدوم سید کبیر نے دعا فرمائی اور کہا۔ اولاد نرینہ تمہارے نصیب میں نہیں البتہ ایک لڑکی ایسی ہوگی جس کی نیکی کی وجہ سے تمہارے خاندان کو شہرت عطا ہوگی۔ (ماخوذ رسالہ نظام المشائخ جولائی ۱۹۱۱ء ص ۹)

عزت بی بی نے پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی۔ ایک بزرگ خواجہ محمد عبداللہ جو مخدوم سید کبیر کے خلیفہ تھے، سے کلام پاک حفظ کیا اور روحانی منزلیں طے کیں (علمائے ہند کے روحانی کارنامے تذکرہ خواجہ عبدالقدوس ص ۲۱۱)

شاہ پور کی اقوام نون۔ ٹوانے۔ رانجھے وغیرہ مخدوم سید کبیر کے مرید تھے۔ مراد بخش نے مرشد سے دریافت کیا کہ مجھے کسی ایسے آدمی کا نام بتایئے جس کی خدمت میں رہ کر میں کچھ حاصل کر سکوں۔ مرشد نے ہدایت کی کہ جھنگ کی عزت بی بی کے پاس چلے جاؤ وہ عارفہ ہے۔

(بحوالہ مضمون پروفیسر اختر علی ندوی ماخوذ ماہنامہ آجکل دہلی جولائی ۱۹۴۷ء)

داں میانہ کے بزرگ حضرت میاں محمد فرماتے ہیں کہ میں ہر جمعرات کو ہیر صاحبہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاتا تھا۔ معمول کے مطابق میں ایک جمعرات کو گیا راستہ میں موضع گھلاپور میں تھوڑی دیر آرام کیا اور بیدار ہونے کے بعد میں نے مریدوں کو حکم دیا کہ چلو واپس جائیں کیونکہ پہلے جب بھی فاتحہ کی

غرض سے آتا تھا مائی صاحبہ میرا استقبال کرتی تھی مگر اب کی دفعہ نہیں آئیں میرا گمان ہے کہ میرا وقت قریب آگیا ہے چنانچہ میاں محمد مریدوں سمیت واپس آگئے اور تیسرے روز وفات پائی۔ (کتاب ذکر العارفین ص ۵۰)

حضرت شاہ جمال چنیوٹ کے ولی کامل گزرے ہیں ان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب ان کو معلوم ہوا کہ مراد بخش رانجھا اپنے مرشد کے حکم پر ہیر صاحبہ کی خدمت میں جانے کے لئے سفر پر روانہ ہوا تو انہوں نے رانجھا کا چناب کے کنارے استقبال کیا۔ مراد بخش کو اپنے ہاں ٹھہرایا۔ ان سے ونجھلی کی فرمائش کی۔ جب رانجھا نے ونجھلی کی تانیں اڑائیں، حضرت شاہ جمال بیتاب ہو گئے اور فرمایا بس کر جٹا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ پہاڑیاں پگھل کر پانی میں بہہ رہی ہیں۔ مجھ میں ونجھلی سننے کی تاب نہیں رہی، جٹا بس کریں ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا۔ ونجھلی بند ہو گئی۔ مراد بخش کو دوسرے دن جھنگ کے لئے انہوں نے رخصت کیا۔"

(بحوالہ مشائخ ہند۔ مطبوعہ مدارس اکیڈمی، تذکرہ شاہ جمالؒ)

ایک اور مستند حوالہ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مخدوم شاہ داؤد کرمانیؒ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے میاں رانجھا اور مائی ہیر کا تذکرہ کیا۔ حضرت نے اسے فرمایا۔ تم نے نیک لوگوں کا تذکرہ کیا ہے خدا تمہاری پانچ پشتوں تک رحمت فرمائے گا۔"

(ماخوذ مقامات داؤدی، حصہ دوم ص ۲۱۱)

یہاں اس بات کی بھی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت مخدوم داؤد کرمانی اپنے عہد کے ولی کامل تھے اور یہ مغل بادشاہ ہمایوں کے دور اول میں وفات پا گئے تھے۔ اس حوالہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہیر رانجھا کا تذکرہ ہمایوں کے عہد سے قبل

عارفان باللہ کی مجلسوں میں ہوتا رہتا تھا لہذا پنجابی کے جن محققین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہیر اکبر کے زمانہ میں ہوئی اور ہندی شاعر دامودر نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قصہ نظم کیا یا جیسا کہ دامودر کی ہیر میں شاعر نے خود چشم دیدہ گواہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ غلط ہے۔ ہیر دامودر کی زندگی سے ایک سو تیس برس قبل اس جہان فانی سے رخصت ہو چکی تھی۔

مخدوم شاہ داؤد کے بعد حضرت شاہ حسین نے ہیر رانجھا کا اپنی کافیوں میں ذکر کیا ہے اس میں بھی ان دونوں کی روحانی عظمت کا اعتراف ہے۔ مثال کے طور پر شاہ حسین نے فرمایا ؎

ماہی ماہی کوکدی میں آپے رانجھن ہوئی
رانجھن رانجھن ہر کوئی آکھے ہیر نہ آکھے کوئی

اسی طرح حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں ؎

"بے ادباں نہ سار ادب دی گئے اوجہاں تھیں وانجے ہو
جہیڑی تھاں مٹی دے بھانڈے کدے نہ ہوندے کانجے ہو
جو مڈھ قدیم دے کھیڑے آہے کدے نہ ہوندے رانجھے ہو
جیں دل حضور نہ منگیا باہو دوہیں جہانے وانجھے ہو"

اب سلطان العارفین صاحب کے ان اشعار کو ذہن میں رکھ کر سوچیں کہ وہ ہیر رانجھا کے بارے میں کیا تصور رکھتے تھے۔

حضرت بابا بلھے شاہ۔ حضرت سچل سرمست۔ حافظ برخوردار اور دیگر صوفی شعرا نے ہیر رانجھا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بدکرداری کا تاثر نہیں دیتا بلکہ دونوں کے روحانی مرتبہ و مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔

حضرت خواجہ غلام فرید چاچڑاں شریف کوٹ مٹھن اپنے عہد کے ولی اللہ تھے

ان کی کافیاں بہت مقبول ہیں۔ انہوں نے ہیر رانجھا کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

کافی نمبر ۱۸ — رانجھن میڈا میں رانجھن دی روز ازل دا کارہ

کافی نمبر ۴۴ — کتھ رانجھن کتھ کھیڑے بھیڑے کتھ رہ گئے او
جھگڑے جھیڑے کتھ چوچک دی جائی اور یار

اسی طرح خواجہ صاحب نے ہیر کا تذکرہ اپنی کافی نمبر ۹۰ - ۱۰۶ - ۱۲۲ - ۱۴۳ - ۱۵۰ - ۱۶۴ - ۱۶۵ - ۱۷۰ - ۱۷۷ - ۱۸۰ - ۱۸۵ - ۲۰۸ میں کیا ہے۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہیر فاحشہ اور بدکردار تھی۔ اس کا اپنے خاندانی ملازم رانجھا سے معاشقہ تھا تو ان دو بدکردار آدمیوں کا ذکر اولیاء اور صوفیا نے اپنے کلام اور اپنے ملفوظات میں نیک و برگزیدہ انسانوں کی طرح کیوں کیا!

اور دیکھئے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی جو سندھ کے صوفی شاعر ہیں نے ہیر رانجھا کا ذکر کن الفاظ میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

تن دی ٹکڑے من دی ٹکڑے — جوں درزی دیاں لیراں
انہاں لیراں دی گل کفنی پا کے — رساں سنگ فقیراں
تیئں جہا مینوں ہور نہ رانجھا — میں جھیاں لکھ ہیراں
رخصت باجھو شاہ رانجھن دے — میں جنت مول نہ وڑساں

ہیر کے موضوع پر مولانا نور احمد فریدی ملتانی نے بھی تحقیق کی ہے۔ ان کی تحقیق کے نتائج بھی میرے ہی تاثرات کی تائید کرتے ہیں۔

اسی طرح پروفیسر اختر علی ندوی صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی۔ جنہوں نے ہیر کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ اپنے اس مقالہ میں نواب بہلول لودھی کے خطوط کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اس مقالہ کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے

اس مقالہ کے مندرجات کی تردید کا حوصلہ ابھی تک کسی کو نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہیر رانجھا کے بارے میں صدیوں سے جو تاثرات لوگوں کے دل و دماغ پر قائم ہیں ان کو دور کرنا سخت مشکل ہے لیکن یہ اہل تحقیق کی ذمہ داری نہیں کہ وہ لوگوں کے خیالات و تصورات کو بدلیں ان کا کام صرف تحقیق ہے ورنہ دنیا میں کون سا سلسلہ ایسا ہے جس پر آرا کا اختلاف نہیں ملتا۔

ہیر رانجھا کی مفروضہ کہانی کو میں علی وجہ البصیرت حقیقت تسلیم نہیں کر سکتا ہر شخص کا اپنا مطالعہ اور اپنی تحقیق ہے۔

مشہور مقولہ ہے کہ اس قدر جھوٹ بولو کہ سچ نظر آئے ہیر کے بارے میں یار لوگوں نے یہی کچھ کیا۔ ہیر کے موضوع پر پنجابی۔ اردو۔ فارسی اور ہندی شعراء اور قصہ نویسوں نے کافی کچھ لکھا ہے مگر ہر قصہ نویس نے واقعات کو اپنے ڈھب پر مرتب کیا ہے ہر شاعر نے اپنے انداز میں واقعاتی کڑیاں ملائی ہیں ایک کے ساتھ دوسرے مصنف اور شاعر کا اتفاق نہیں یہاں تک کہ بیشتر شعراء اور وقائع نویسوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہیر رانجھا کو انہوں نے خود دیکھا اور واقعات ان کے سامنے ہوئے زمانوی اختلاف کے علاوہ ناموں اور علاقوں کا اختلاف بھی نمایاں ملتا ہے جیسا کہ ہندی شاعر دامودر کا دعوٰی ہے کہ ہیر مغل تاجدار اکبر کے عہد میں ہوئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے واقعات ہوئے جبکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات غلط ہے۔ شاعر کے اس دعویٰ کی تردید خود پنجابی زبان کے مورخوں نے کر دی کہ دامودر ہیر کے عہد کا شاعر نہیں بلکہ اس نے یہ قصہ شاہ جہان یا اورنگ زیب کے عہد میں لکھا تھا۔

(پنجابی قصے فارسی زبان میں ص ۱۸ از ڈاکٹر محمد باقر)

مگر میں کہتا ہوں کہ اگر دامودر اکبر کے عہد کا بھی ہوتا تب بھی ہیر اور اس کے زمانے کا بڑا فاصلہ ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں ایک فارسی شاعر سعید سعیدی گزرا

ہے اس کا کہنا ہے کہ قصہ ہیر رانجھا سب سے پہلے اسی نے نظم کیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ فارسی کا یہ قدیم نسخہ ہے۔ (پنجابی قصے فارسی زبان میں ص ۸۲)

اب دامودر کا دعویٰ قطعی غلط ہو گیا۔

عہد شاہ جہان کے وزیر اعظم اسلام خان مشہدی جن کو ہٹا کر جھنگ کے نواب سعد اللہ خاں کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا کا ادبی نام ہمت خان تھا اس نے ہیر کو پہلی بار ہندی میں نظم کیا اور پھر اس قصہ کو اپنے درباری شاعر محمد عاشق لائق کے حوالہ کیا جس نے اسے فارسی نظم میں ڈھالا۔ لائق کا بیان ہے کہ اس سے قبل یہ واقعہ مشہور نہ تھا۔

(اورنٹیل کالج میگزین اگست ۱۹۲۷ء)

یہ حوالہ اور بھی دلچسپ ہے کہ حکیم علیم الدین انصاری موضع کلاس ضلع گوجرانوالہ کے مشہور طبیب تھے انہوں نے شاہ جہاں کی بیگم کا علاج کیا۔ صحت یابی کی خوشی میں ان کو نواب وزیر خان کا خطاب دے کر حاکم لاہو مقرر کیا گیا تھا ان کا ایک لڑکا میتا عرف چنابی تھا۔ سب سے اول ہیر کا قصہ اسی چنابی نے لکھا اور نظم بند کیا

(ماخوذ پنجابی قصے فارسی زبان میں از ڈاکٹر محمد باقر)

آپ اندازہ لگائیں کہ تاریخ کو کس طرح جھٹلایا گیا ہے جبکہ حکیم علیم الدین انصاری چنیوٹ کے تھے اُن کو جہانگیر کے عہد میں نواب وزیر خان کا خطاب ملا تھا اور وہی حاکم لاہو مقرر ہوئے تھے ان کا کوئی بیٹا میتا یا چنابی نہیں تھا اور اگر چنابی نام کا بیٹا تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ہیر کا جو واقعہ نظم کیا اس میں وہ "ہیر و ماہی" کا ذکر کرتا ہے۔ ہیر کے ساتھ رانجھا کا ذکر نہیں ملتا۔ عنوان ہی ہیر و ماہی رکھا یہ ماہی کون تھا؟ بات بالکل واضح ہے کہ نولوں اور کھرلوں کی سیالوں سے سیاسی دشمنی و عداوت نے اس قصہ کو پھیلایا اس کا تاریخی ثبوت اس حوالہ سے ملتا ہے۔ ہیر کا قصہ سب سے اول کوٹ کمالیہ کے رئیس محبت خان کھرل نے جو دربار عالمگیر کا منشی بھی

تھا کے ایسا پر لکھا گیا کیونکہ جھنگ کے سیالوں اور کمالیہ کے کھرلوں کے درمیان ہمیشہ سے سیاسی عداوت اور دشمنی چلی آرہی تھی اور سلاطین دہلی اکثر ان دونوں میں صلح صفائی کراتے رہتے تھے۔ سیالوں کی ہتک اور توہین کے لئے کھرلوں نے اس واقعہ کو پھیلایا۔

(کتاب پنجابی قصے فارسی زبان میں، از ڈاکٹر محمد باقر ص ۱۱۹)

اب بات مزید واضح ہو گئی کہ مفروضہ کہانی کن ذرائع سے فروغ پذیر ہوئی۔

ایک اور شاعر نواب احمد خان یکتا جو خوشاب کے نوابوں میں سے تھے، نے ہیر کو نظم کیا ان کا کہنا ہے کہ رانجھا بھی قوم کا سیال تھا اور اس کا نام رانجھا تھا نواب یکتا نے ساری کہانی کا بیڑا غرق کر دیا مگر اس کے باوجود بھی ہیر کا قصہ لکھنے پر مجبور ہوئے۔ نواب یکتا کی وفات ۱۱۴۸ھ میں ہوئی جو قریب تر زمانہ تھا مگر اپنے سابقین سے بعض معاملات میں سبقت لے گئے ایک رو میں بہہ کر قصہ کو وہیں پہنچایا جہاں اس کو پہنچانا مقصود تھا۔ وارث شاہ صاحب تو محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں ہوئے ان پر تو اس دور کے حالات کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔

اور سنئے جس زمانہ میں میر معین الدین والئی پنجاب تھے ایک ہندو سندر داس آرام نام کا لاہور میں شاعر گزرا ہے اس نے فارسی میں ہیر رانجھا کا قصہ نظم بند کیا وہ لکھتا ہے کہ میں گورنر کے حکم پر جھنگ پہنچا۔ وہاں رات کو سویا ہوا تھا کہ خواب میں مجھے ہیر رانجھا ملے انہوں نے مجھے قصہ لکھنے کی فرمائش کی۔ جس کی تعمیل میں طویل نظم لکھی گئی۔ شاعر نے اس نظم میں ہیر کے باپ کا نام مسلم لکھا ہے

(مثنوی گلشن آرام ص ۳۲)

مشہور کتاب "قبائل پنجاب" کے انگریز مؤلف نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ کمالیہ کے کھرلوں اور جھنگ کے سیالوں کے درمیان مدت سے سیاسی دشمنی چلی آرہی ہے۔ مغل بادشاہوں نے دونوں کے درمیان متعدد بار مصالحت

کرانے کی کوششیں کیں مگر ان کو ناکامی ہوئی۔ کھرلوں نے سیالوں کی ہتک کرانے کے لئے ہیر کا قصہ مشہور کیا۔

(ماخوذ کتاب "تباہی پنجاب" انگریزی ایڈیشن)

★

میں ہیر کے موضوع پر کافی حد تک تحقیق مکمل کر چکا ہوں اور ہیر کی حقیقت پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں جس میں تمام تاریخی حوالے، صوفیائے کرام کے فرمودات اور سیالوں کی سابقہ تاریخ پر بحث ہو گی اور یہ کتاب کافی حد تک ہیر رانجھا کی مفروضہ داستان کی قلعی کھول دیگی، چونکہ "جھنگ کی لوک کہانیوں" میں اتنی گنجائش نہ تھی اس لئے زیادہ حوالے نہیں دے سکا۔

بلال زبیری

مرزا صاحباں

۱۶۲۰ عیسوی

پانچ دریاؤں کی سرسبز و شاداب اور قدرت کے عطیات سے معمور نگری جہاں شجاعت و بہادری کے کارناموں کی وجہ سے مشہور ہے وہاں اس کے دامن میں عاشقان مجازی کی داستانیں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان میں دریائے چناب کا ساحل زیادہ مشہور ہے جس کی لہروں نے حسن و عشق کے ان مجسموں کو تراش کر ادبیات عالیہ اور ثقافت کا شاہکار بنا دیا۔ سوہنی مہینوال۔ سسی پنوں۔ ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں چناب ہی کے ساحل کے تراشیدہ بت ہیں جن میں عاشقان مجاز کے لئے کعبہ ایسی خوبو پائی جاتی ہے جو رہتی دنیا تک پائندہ و تابندہ رہے گی ان کے دامن سے ہزار برائیاں باندھی جائیں مگر ان کے عشقیہ کردار ان وسوسوں اور اندیشوں سے ماورا ہو کر ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو چکے ہیں۔ ہیر رانجھا کا ذکر ضمنی طور پر اس داستان میں آگیا ہے چونکہ اس واقعہ کی عرفیت اسی طرح مشہور ہے مگر حقیقت میں ہیر اور رانجھا عشقیہ کردار نہیں تھے۔ شعراء کرام نے اپنے عشق و لگن کے لئے ان کے ساتھ کہانیاں منسوب کر دیں۔ اسی طرح مرزا صاحباں جو حقیقی طور پر عشقیہ داستان ہے اور واقعہ کی نوعیت و ماہیت تقریباً وہی ہے جو شعراء نے بیان کی ہے مگر اس داستان میں بھی ایک تاریخی تسامح موجود ہے جس کا ذکر آگے آئیگا۔

مرزا صاحباں کی داستان کو سب سے پہلے ایک مقامی شاعر پیلو نے نظم بند کیا۔ پیلو مرزا صاحباں کا ہم عصر تھا اور اس نے چدھڑوں۔ ماہنی سیالوں اور ساہی قبیلوں کی جنگوں کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ واقعات اس کے سامنے ہوئے لیکن پیلو صرف شاعر تھا۔ داستان گو تھا۔ اس نے واقعات کو اسی ذہنی نہج پر ڈھالا جو اس کا مقصود

تھا اگر وہ مورخ ہوتا تو تاریخی تسامح کی گنجائش نہ چھوڑتا۔

اس داستان کا پس منظر تاریخی اعتبار سے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ رائے سیال جد اعلیٰ اقوام سیال جو بابا فریدالدین گنج شکر کے عہد میں مسلمان ہوا تھا، کی بارھویں پشت پر ماہنی سیال کی اولاد میں ایک شخص ستی گزرا ہے یہ اپنے دور کا نہایت بہادر انسان تھا اور مختلف جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔

یہاں ایک بات واضح کرتا جاؤں کہ رائے سیال کے تین لڑکے ماہنی۔ بھرمی اور کوہلی پیدا ہوئے۔ بھرمی اور کوہلی کی اولاد زراعت پیشہ بن گئی اور کاشتکاری کا کام شروع کر دیا مگر ماہنی کی اولاد نے کوئی مستقل پیشہ اختیار نہ کیا بلکہ خانہ بدوشوں کی طرح جھنگ۔ شاہ پور۔ گوجرانوالہ۔ ساہیوال۔ بہاول پور۔ ملتان۔ مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں تک کے علاقوں میں در بدر پھرتی رہی۔ کبھی فوج میں ملازمت کر لی، کبھی محنت مزدوری کر کے سامان زندگی حاصل کیا اور کبھی ڈکیتی و رہزنی اختیار کی ماہنی کی اولاد کا کوئی مستقل ٹھکانا اور ذریعہ معاش نہ تھا۔ ہیر کے عہد میں جب مل خاں جھنگ کا پہلا حکمران تسلیم ہوا تو اس نیک دل حاکم نے ماہنی سیالوں کو وہ جہاں جہاں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے، تلاش کرایا اور ان کو جھنگ میں مستقل آباد کرنے کا ارادہ کیا لیکن موت نے مل خان کو اس اہم کام کی مہلت نہ دی۔ مل خان کے انتقال کے بعد دولت خان اور اس کے بعد غازی خان حکمران ہوئے۔ غازی خان نے اپنے عہد حکومت میں ماہنی سیالوں کے سربراہ ستی خان کو اپنے دربار میں بلایا اور اسے اپنے دیگر بھائی بندوں کی طرح مراعات دیں۔ غازی خان نے ستی سے کہا کہ وہ اپنی ساری اولاد کو ایک جگہ جمع کر لے اور اپنے لئے جو علاقہ پسند کرے وہ اسے دے دیا جائے گا چنانچہ ستی اپنے قبیلہ کو جو رادی کی طرف خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا اپنے پاس بلا لیا۔ موجودہ قصبہ ستیانہ جہاں آباد ہے اس کے آس پاس کا تمام علاقہ ساندل بار تک غازی خان نے ستی خان کو بخش دیا۔ اور ستی کی اولاد نے

قصبہ ستیانہ آباد کر کے مستقل رہائش اختیار کر لی۔

غازی خان ماہنیوں کی آباد کاری دو وجوہ سے چاہتا تھا پہلی وجہ تو یہی تھی کہ اس کے ہم کفو خانہ بدوشی اور غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں جس کا اسے روحانی قلق تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ تمام سیالوں کو اپنی سلطنت قائم و دائم رکھنے اور اپنی سیاسی قوت کو موثر بنانے کے لئے حامی و مددگار بنانا چاہتا تھا چنانچہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اس کا سیاسی اثر ساہیوال اور کمالیہ تک وسیع ہو گیا۔ ستی کے بعد اس کا بڑا بیٹا کھیوہ خان اس کا جانشین مقرر ہوا۔ کھیوہ خان اپنے عہد کا جہاندیدہ۔ شریف اور سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک عزت مند شخص تھا۔ کھیوہ خان اپنی پیدائش کے صرف ایک ماہ بعد ماں کی مامتا سے محروم ہو گیا تھا اور اس کی پرورش مڑھل قوم کی ایک عورت کے سپرد کر دی گئی تھی اس وقت مڑھل قوم علاقہ داڑہ ساحل چناب کی ایک ذیلی ریاست کی حکمران تھی۔

کھیوہ خان نے نوراں مڑھل کی گود میں اس کی حقیقی لڑکی فتح بی بی کے ساتھ پرورش پائی۔ یعنی فتح بی بی اور کھیوہ خان دودھ شریک بہن بھائی تھے۔ یہی عورت کمالیہ کی ساہی قوم کے سردار ونجھل سے بیاہی گئی جس سے دانا آباد کا مرزا پیدا ہوا۔ جو حسن و عشق کی تاریخ کا کردار بنا۔

مرزا صاحباں کے واقعہ کو جن شعراء نے نظم بند کیا ان سے یہی غلطی سرزد ہوتی رہی کہ وہ مرزا کو کھیوہ خان کا حقیقی بھانجہ لکھتے رہے حالانکہ مرزا اُس کا بھانجہ نہیں تھا لیکن کھیوہ خان نے جس طرح زندگی میں اپنی دودھ شریک بہن کی عزت کی اسی طرح مرزا پر بھی شفقت کرتا رہا۔ کھیوہ خان جس ذیلی ریاست کا حکمران تھا اس کی حدود شمال کی طرف ریاست بھوانہ اور داڑہ۔ مغرب کی طرف ذیلی ریاست نگھیانہ جو سیال سردار میگھا نے قائم کی تھی۔ جنوب کی طرف رشید پور اور مشرق کی طرف کوٹ ملکھانہ تک وسیع تھی۔ تمام ریاستیں غازی خان سیال حکمران کے

تابع اور اس کی خراج گزار تھیں۔

مڑھل قوم جو تقریباً ڈیڑھ سو برس ذیلی ریاست کی حکمران رہی کے رشتے ناطے ساہی قوم سے تھے اور ان دونوں کے درمیان اچھے تعلقات تھے بلکہ بعض وقائع نگاروں نے ساہی قوم کو سیالوں کی ایک شاخ بتایا ہے مگر مجھے سیال خاندان کے کسی شجرہ سے اس کی سند نہیں ملی البتہ ان سیالوں میں ساہو نام کے ایک شخص کا ذکر ملتا ہے ممکن ہے ساہی اسی ساہو کی اولاد ہوں۔ دوسری طرف ساہی قوم کمالیہ کے گرد و نواح کی حکمران کھرل قوم سے گہرے مراسم رکھتی تھی اور ان دونوں کے درمیان بھی رشتے ناطے موجود تھے بعض وقائع نگاروں نے ساہی قوم کو کھرل قوم کی ایک شاخ ظاہر کیا ہے۔ یہ تحقیق اپنی جگہ ایک موضوع ہے اس کا زیرِ قلم کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔

کھیوہ خان اپنی قائم کردہ ریاست کا پہلا حکمران تھا اس کی موت کے بعد شمیر خان جو کھیوہ خان کا لڑکا تھا حکمران تسلیم کیا گیا۔ شمیر خان کے بعد اس کا بیٹا ملک علی خان اس کے بعد اس کا بیٹا فتو حل خان اور اس کے بعد اس کا لڑکا صاحب خان حکمران بنے۔ صاحب خان نہایت جری اور بہادر شخص تھا اس نے اپنی ریاست کی حدود پر پختہ چوکیاں اور برج تعمیر کرائے اور ریاست واڑہ سیلمان جس پر مڈھل قوم حکمران تھی پر حملہ کر کے اسے شکست دے کر اپنی حدود میں شامل کر لیا تھا۔

صاحب خان نے اپنے پردادا کھیوہ خان اور مڑھل قوم کے تعلقات کو اپنے سیاسی اقتدار کے لئے پس پشت ڈال دیا لیکن اس کی موت کے بعد ریاست کھیوہ کا زوال شروع ہو گیا۔ صاحب خان کے بعد اس کا لڑکا اللہ یار خان اس کے بعد اس کا بیٹا دلیداد خاں پھر حاجی محمود خان اور آخری حکمران عمر خان برسرِ اقتدار آئے۔ عمر خان کو صاحب خان جھنگ کے سیال حکمران نے شکست دے کر کھیوہ اور واڑہ سیلمان۔ ستیانہ وغیرہ اپنی حدود میں شامل کر لئے۔ اس طرح کھیو خان کی اولاد اقتدار سے محروم ہو گئی

۱۵۷۵ء تا ۱۶۱۰ء کا زمانہ دہلی پر مغل تاجدار جہانگیر کی حکومت تھی اور جھنگ

میں اس کا نمائندہ غازی خاں بطور حکمران موجود تھا۔ کھیوہ خان کی ریاست امن و خوش حالی کی امین تھی۔ سرسبز کھیت۔ ہنستی کھیلتی بستیاں۔ مسکراتے مچلتے لوگ، چاروں طرف خوش حال لوگوں کی آبادیاں۔ کھیوہ شہر کے اونچے محل اور ماڑیاں کھیوہ خان کی حکومت کے نشان تھے۔ اس کے سرکاری محل سے ملحقہ حویلی میں مسجد کے ساتھ مدرسہ قائم تھا جس میں حکمران کی بیٹی صاحباں جس کے چہرے پر معصومیت کھیلتی تھی مولوی امداد علی کے پاس پڑھتی تھی۔ صاحباں حکمران کی بیٹی ہونے کی وجہ سے ہم مکتب بچوں میں نمایاں حیثیت سے دیکھی جاتی تھی۔ صاحباں اگر وقت مقررہ پر مدرسہ نہ آتی تو مولوی صاحب اسے خود لینے جاتے جبکہ یہ فخر کسی اور بچے کو حاصل نہ تھا۔ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد اکثر مولوی صاحب ہی اسے محل میں چھوڑ آتے تھے۔ ریاست کے خزانہ سے مدرسہ کے مولوی صاحب کا معقول وظیفہ مقرر تھا۔

چھ ماہ کے بعد مرزا بھی اپنے ماموں کھیوہ خان کے پاس آگیا اور اسے صاحباں کے ساتھ مدرسہ میں بٹھا دیا گیا۔ مرزا اور صاحباں کے درمیان پہلی ملاقات نے ہی محبت کا روپ اختیار کر لیا۔ معصوم دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہوگئیں۔ دونوں ایک ساتھ مدرسہ جاتے۔ پاس پاس بیٹھ کر پڑھتے۔ اکٹھے واپس آتے اور ایک ساتھ روٹی کھاتے اور پہروں کھیوہ کے باہر ریتلے میدان میں کھیلتے۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ریت کی سطح اونچی کر کے مکان بناتے اور پھر پاؤں کی ٹھوکروں سے گرا دیتے۔ ان کا یہی مشغلہ تھا۔

مدرسہ میں مولوی کتاب پڑھاتا مگر دونوں اس درسی کتاب کے بجائے عشق و محبت کی لافانی کتاب کے اسباق پڑھنے لگے۔

مشہور ہے کہ ایک دفعہ مولوی صاحب نے مرزا کے ہاتھوں پر اس قدر ڈنڈے مارے کہ اس کے ہاتھ سوج گئے۔ مرزا مار کھاتا اور صاحباں مار کی درد سے تڑپ تڑپ جاتی۔ ڈنڈے کے نشان مرزا کی بجائے صاحباں کی نازک ہتھیلی پر پڑتے

رہے۔ صاحباں روتی ہوئی گھر پہنچی اس کی ماں نے اس کے ہاتھ دیکھ کر حقیقت دریافت کی۔ صاحباں نے واقعہ من و عن بتادیا۔ معاملہ کھیوہ خان کے علم میں آیا۔ اس نے مولوی کو طلب کر کے اسے کہا کہ چھوٹے بچوں کو اس قدر مارنے سے ان کے دل تعلیم سے اچاٹ ہو جاتے ہیں۔ مولوی کھیوہ خان کی سخت سست باتیں اطمینان سے سنتا رہا اور جب اس کا غصہ نرم ہو گیا تو مولوی نے اسے وہ کچھ بتایا جو ایک باپ اپنی بیٹی کے بارے میں سننا پسند نہیں کرتا۔ چونکہ ابھی دونوں کمسن اور نوعمر تھے اس لئے معاملہ نے سنگین صورت اختیار نہ کی۔ کھیوہ خان نے صاحباں کو مدرسہ سے ہٹالیا اور مرزا کو چند روز گھر میں رکھنے کے بعد دانا آباد واپس بھجوا دیا۔

کھیوہ خان تو صرف یہی احتیاط کر سکتا تھا ایک طرف بیٹی تھی۔ دوسری طرف دودھ شریک بہن کا بیٹا تھا جسے وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا۔ مرزا واپس چلا گیا مگر اس کا دل کھیوہ کے در و دیوار میں اٹک گیا تھا۔ صاحباں اپنے گھر رہنے لگی مگر اس کا دل ہوا کی لہروں کے ذریعے اڑ کر دانا آباد پہنچ گیا۔ بچپن کی محبت رنگ لانے لگی۔ دونوں کی بیقراریاں بڑھتی رہیں۔ دونوں تنہائی میں ایک دوسرے کو یاد کر کے رونے لگے۔ آنسوؤں کی برساتیں شروع ہوئیں اور عشق کا موسم برشگال بوا چلا گیا۔ مرزا بے قراریوں اور اضطراب کے تحت کئی بار چھپ چھپ کر کھیوہ آتا اور خفیہ طریقوں سے صاحباں کو ملتا۔ صاحباں راز دار سہیلیوں کے ہمراہ محل کے باہر مرزا سے رات رات بھر باتیں کرتی۔ ادھر پو پھٹتی اور ادھر مرزا گھوڑی پر سوار ہو کر دانا آباد لوٹ جاتا۔ مرزا کی گھوڑی اعلیٰ النسل کی تھی یہ اتنی تیز رفتار اور سدھائی ہوئی تھی کہ سورج ڈھلے مرزا اپنے گاؤں سے اس پر سوار ہو کر کھیوہ آتا صاحباں سے ملاقات کر کے پھر سورج نکلنے سے پہلے اپنے گاؤں پہنچ جاتا۔

مرزا کی جوانی کی کنار راوی کی عورتیں قسمیں کھایا کرتیں اور صاحباں کے حسن کی تعریف میں گیت گاتیں۔ مرزا صاحباں جوان ہو گئے۔ مرزا نے ماں سے کہا کہ میں صاحباں

سے محبت کرتا ہوں اگر صاحباں مجھے نہ ملی تو تم میری جوانی کو رو لینا۔

دوسری طرف صاحباں کی خواہش سے اس کی ماں باخبر تھی۔ مرزا کی ماں بیٹے کی آرزو لے کر کھیوہ خان کے پاس آئی اور اپنی ماں کے دودھ کا واسطہ دیکر کھیوہ خان سے کہا کہ اس دودھ کی لاج رکھتے ہوئے صاحباں کی منگنی مرزا سے کر دو۔ مگر کھیوہ خان نے ہمیشہ یہ کہہ کر انکار کیا کہ تم میری بہن ہو میں تجھے ہرگز خالی نہ بھیجتا مگر مرزا کی وجہ سے میری بیٹی کی شہرت خراب ہو چکی ہے آج اگر بیٹی کی ڈولی اس کے حوالہ کر دوں تو میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ میں ریاست کا حاکم ہوں میرا حکم رعایا پر چلتا ہے لوگ کیا کہیں گے کہ بیٹی پر اس کا حکم نہ چل سکا۔ تاہم کھیوہ خان انکار کے باوجود اپنے دل میں خلش اور چبھن محسوس کرتا رہا۔ جب کبھی وہ صاحباں کی روتی آنکھوں کو دیکھتا تو اس کا دل بے چین ہو جاتا اور جب اسے یہ احساس ہوتا کہ وہ ریاست کا حکمران ہے تو اس کی انا جاگ اٹھتی کھیوہ خان نے اس کشمکش سے چھٹکارا پانے کے لئے صاحباں کی نسبت جلد سے جلد کرنے کا فیصلہ کر لیا اس زمانے میں چدھڑ قوم جس کا تعلق پنوار سے تھا سر کردہ شمار ہوتی تھی۔ اس قوم کے سردار جھانب کے لڑکے طاہر خان سے صاحباں کی منگنی کر دی گئی۔ منگنی کی رسم کیا ہوئی کہ صاحباں کے لئے کفن تیار ہونے لگا۔ صاحباں رات رات بھر جاگتی اور مرزا کا انتظار کرتی مگر مرزا کو اس کی ماں نے قید کیا ہوا تھا وہ جانتی تھی کہ کھیوہ خان کا فیصلہ اٹل ہے۔ اور اگر مرزا نے اس فیصلہ کو بدلنے کی کوشش کی تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ دانا آباد اور کھیوہ کے درمیان خون کی مستقل حدیں قائم ہو جائیں گی۔ ایک طرف بیٹے کی بے قراری۔ دوسری طرف بھائی کی عزت اور ریاست کا طنطنہ اور پھر مجبور و مظلوم صاحباں کی معصوم امنگوں کا قتل، یہ سب کچھ مرزا کی ماں کے سامنے تھا۔ مرزا خود ایک خوبصورت بیوی کا شوہر بن چکا تھا اس کے سسرال کھرلوں کے رئیس تھے۔ ہزار قسم کی مشکلات سامنے تھیں مگر مرزا کسی طرح صاحباں کی محبت سے دستبردار نہ ہوا۔

صاحباں کے بیاہ کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ کھیوہ خان نے بارات کے استقبال کی

تیاریاں کرلیں۔ بیٹی کا جہیز اتنا بڑا دیا کہ اس کی ریاست کی پوری آمدنی اس کے برابر ہو گی برات آنے سے صرف ایک رات پہلے صاحباں کی بے قراریوں میں طغیانی آئی۔ اس کی جواں امنگوں کے ذخیروں سے ہوک اٹھی اور وہ مرزا کو بلانے کے لئے کرموں برہمن کے پاس آئی جو ان کے عشق کا رازداں تھا اور عمر میں کھیوہ خان کے برابر۔ صاحباں نے کرم چند برہمن سے کہا کہ تم ہماری محبت سے واقف ہو۔ میں اس ریاست کے حکمران کی اکیلی اور نعمت پلی بیٹی ہوں مجھے باپ کی ریاست اور اس کے کروفر سے کوئی دلچسپی نہیں نہ مجھے جھانب چدھڑ کے بیٹے سے کوئی لگن ہے میں دنیا کی ہر آسائش اور دولت کے ہر سامان پر مرزا کو ترجیح دیتی ہوں مجھے یقین ہے کہ مرزا میری دعوت پر ضرور آئے گا اور مجھے اس الجھن سے نکال کرلے جائیگا وہ مجھے ایسی جگہ پہنچا دے گا جہاں ہم دنیا سے دور اپنی الگ دنیا آباد کریں گے۔ تم مرزا کے پاس جاؤ اور اسے میرا پیغام پہنچا دو میں تمہیں تیز رفتار گھوڑی دیتی ہوں اور انعام میں ایک بھینس اور سو اشرفی۔

پہلے تو کرم چند برہمن نے صاحباں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ جب وہ کسی طرح باز نہ آئی تو پھر یہاں تک کہا کہ اگر تجھے چدھڑوں سے نفرت ہے تو مجھ سے محبت کرلے میں تیری محبت کا پالن کروں گا۔ صاحباں کے لئے کرم چند کا یہ کہنا ناقابل برداشت تھا لیکن اس نے جواب میں یہی کہا کہ تم میرے باپ کے برابر ہو۔ کیا باپ اپنی بیٹی کے ساتھ عشق لڑا سکتا ہے شرم کرو۔" کرم چند نے دیکھا کہ صاحباں کسی طرح بھی باز نہیں آسکتی تو اس نے مرزا کو بلانے کی حامی بھرلی اور اسی رات دانا آباد چلا گیا جہاں پہنچ کر اس نے مرزا کو حالات اور صاحباں کی بے قراری سے آگاہ کیا۔ مرزا نے اسی وقت اپنی گھوڑی بکی پر زین کس لی اور تنہا کھیوہ آنے کا فیصلہ کیا جب اس کی ماں کو معلوم ہوا تو اس نے اسے ہر طرح سے روکنا چاہا۔ اسے سمجھایا کہ سیال عموماً بدچلن اور بدمعاملہ ہوتے ہیں ان کی عورتیں جادو ٹونے کرتی ہیں اور مردوں کے کلیجے نکال کر چبا جاتی ہیں تو اس عمر میں مجھے رسوا نہ کر۔ میری بوڑھی ہڈیوں کی کھار نہ بنا اور میرے سفید بالوں کی لاج رکھ، تجھے یاد نہیں کہ

جب میں تیری منگ کا پیغام لے کر کھیوہ خاں کے پاس گئی تھی تو اس نے شربت کا گلاس لے کر زمین پر پھینک دیا تھا مجھے اپنے گھر سے نکال دیا تھا اب تم کس منہ سے وہاں جاؤ گے وہ تمہارے خون کے پیاسے ہیں مجھے ڈر ہے کہ کہیں صاحباں بھی تجھے دھوکہ نہ دے جائے مگر مرزا نے ماں کی باتوں کو قبول نہ کیا اور جواب میں صرف اتنا کہا کہ ماں موت کا ایک وقت مقرر ہے اگر میری تقدیر میں سیالوں اور چدھڑوں کے ہاتھ سے مرنا لکھا ہے تو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا مگر میں اپنی محبت پر داغ نہ آنے دوں گا صاحباں نے مجھے پکارا ہے میں اس کی امداد کے لئے ضرور جاؤں گا۔

مرزا بکی لے کر گھر سے باہر نکلا تو اس کی بہن چھتی نے اس کا دامن تھام لیا اس نے کہا مرزا تمہیں معلوم ہے کہ چند روز تک تمہاری بہن کو بیاہنے کے لئے بھٹی بارات لے کر آ رہے ہیں اور تم تنہا اس طرف جانا چاہتے ہو جہاں سے زندہ لوٹ آنا غیر ممکن ہے تم میرے ویر اور بھائی ہو کم از کم اتنے دن کے لئے رک جاؤ کہ میری ڈولی اپنے ہاتھوں سے بھٹیوں کے حوالہ کر دو تاکہ بہن کے دل میں یہ حسرت نہ رہے کہ بھائی مرزا نے اس کی ڈولی کو کندھا نہیں دیا تھا۔" لیکن مرزا نے بہن کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور بکی کو لے کر باہر نکل آیا ابھی سوار نہیں ہوا تھا کہ باپ ونجھل نے پکارا، مرزا اپنی جوانی کو سنبھال۔ عورت ذات پر بھروسہ نہ کر۔ یہ ایسی مخلوق ہے جو ہنس کر دوستی لگاتی ہے اور رو رو کر دنیا کو بتا دیتی ہے۔ جس گھر کی عورت سے دوستی ہو جائے سمجھدار دل کا کہنا ہے کہ اس گھر میں انسان کبھی نہ جائے ورنہ اس کی جان اور عزت دونوں کا نقصان ہو گا۔" مرزا نے بوڑھے باپ کی بات سن کر سر جھکا دیا اور آگے بڑھا۔ جب بوڑھے نے دیکھا کہ اس کا بیٹا جوانی میں کسی کوئی مشورہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں تو کہا مرزا اگر تم اپنی ہی ضد کرنا چاہتے ہو تو سن لو۔ جاؤ خدا تمہاری نصرت کرے اور صاحباں کے بغیر کھیوہ سے نہ آنا ورنہ ہماری عزت نہیں رہے گی راجہ اپنی حکومتوں پر افسوس کرتے ہیں جنہیں وہ ضائع کر بیٹھتے ہیں اور چور اس مال کا جسے وہ چھوڑ آئیں۔ عورتیں حسن نہ ہونے پر کڑھتی

ہیں اور مور اپنے سیاہ پاؤں دیکھ کر۔ مگر ایک بہادر انسان کی عزت اس وقت خاک میں مل جاتی ہے جب اسے اپنی مہم میں ناکامی ہو۔ مرزا تم ناکامی کا داغ قوم کی پیشانی پر نہ لگوانا

مرزا بکی پر سوار ہو کر ہوا میں اڑتا ہوا چالیس میل کا فاصلہ طے کر کے کھیوہ پہنچ گیا جہاں چدھڑوں کی بارات صاحباں کو بیاہنے آ رہی تھی۔

مرزا نے گھوڑی ایک کچے مکان میں باندھ دی اور مکان کی مالک بیبو بڑھیا جسے وہ منہ بولی خالہ کہتا تھا ملا۔ اسے صاحباں کے پاس بھیجا کہ مرزا کچی حویلی میں تمہارا انتظار کر رہا ہے ادھر چدھڑوں کی بارات کھیوہ خان کے محل میں داخل ہوئی اور ادھر صاحباں جو زیورات سے لدی اور ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی اپنے محل سے کچی حویلی میں آتری مرزا نے ہاتھ کا سہارا دے کر اسے تھام لیا اس کی چمکتی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے اور بکی کی پشت پر بٹھا کر ایڑ لگائی۔ بکی ہوا کی طرح اڑتی ہوئی کھیوہ کی حدود سے باہر نکلی۔ چند لمحوں بعد کہرام مچ گیا۔ صاحباں چلی گئی اسے مرزا اغوا کر لے گیا۔

چدھڑوں اور سیالوں کے جوان پلی ہوئی گھوڑیوں پر سوار ہو کر ٹولیوں کی صورت میں ساندل بار میں داخل ہو گئے۔ گھنا جنگل چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں مرزا اپنی صاحباں کو لیکر ایک جنڈ کے نیچے آرام کرنے کے لئے اترا اور اپنا تیر کمان جنڈ کی ایک اونچی گھار پر لٹکا دیا۔ بچھڑے ساتھی ملے اور نشے میں چور مدہوش ہو گئے۔ صاحباں نے گھوڑوں کے بھاگنے کی آواز سنی وہ بیدار ہوئی گھوڑوں کی آوازیں تیز تر اور قریب آنے لگیں۔ صاحباں نے مرزا کو نیند سے بیدار کیا۔ دشمن آ پہنچے مگر مرزا مردانہ حسن و جوانی میں مخمور بے پروا ہو کر پڑا رہا جب گھوڑے قریب آ گئے اور صاحباں کے بھائی شمیر نے للکارا کہ مرزا ہوشیار ہو جا اب سیالوں کی غیرت کا نمونہ دیکھ۔ مرزا ایک دم اٹھا اس نے شمیر پر بھرپور حملہ کیا جس سے شمیر گھوڑی سے گر پڑا اچانک مرزا کے سینہ میں زہر آلود تیر آ کے لگا وہ سنبھلا اور جنڈ کی اوٹ میں اس نے اپنے جسم سے تیر کھینچ کر باہر نکالا ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ چدھڑوں نے حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ مرزا راوی کا فخر اور صاحباں کا تاج بے جان ہو گیا۔

سیالوں اور چدھڑوں نے صاحباں کو اپنے قبضہ میں لے کر مرزا کی نعش اٹھائی اور خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے کھیوہ پہنچے صاحباں کو بند کمرہ میں پھینک دیا گیا۔

کھیوہ خان نے صاحباں کی جگہ دوسری لڑکی خان ظاہر چدھڑ سے بیاہ دی اور صاحباں کو قتل کر کے اس کی نعش مرزا کی نعش کے پاس رکھ دی تاکہ بیاہ کی تقریب ختم ہونے کے بعد ان کو دفن کیا جا سکے۔ لیکن اس دوران ساہی قوم نے مرزا کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے کھرل اور بھٹی قوم کے جوانوں کو پکارا۔ تینوں اقوام کے شاہ سوار اسی وقت سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے کھیوہ پہنچے اور کھیوہ خان کے محل کو محاصرہ میں لے کر دونوں کی لاشیں طلب کیں۔ کھیوہ خان نے مرزا صاحباں کی لاشیں مرزا کے باپ ونجھل کے سپرد کر دیں۔ جواں بیٹی اور جواں بھانجے کی لاشیں دیکھ کر کھیوہ خان کی آنکھیں بھر آئیں مگر منہ سے کچھ نہ کہا ونجھل نے کھیوہ خان سے کہا تم نے اپنی بہن کے خون اور گوشت کو محض دنیاوی عزت و حکومت کے لئے تڑپایا ہے یقین رکھو یہ عزت چند سال کے بعد تمہاری اولاد میں ختم ہو جائے گی اور تمہاری پیشانی پر جواں بیٹی کی موت کا داغ قیامت تک قائم رہے گا۔

مرزا صاحباں کی لاشیں دانا آباد لا کر دفن کر دی گئیں اور پھر چالیس برس تک سیالوں اور کھرلوں میں ایسی خوفناک جنگیں ہوتی رہیں جن میں ہزاروں انسان موت کا شکار ہوئے۔

بعض وقائع نگاروں کا خیال ہے کہ مرزا کی نعش کھیوہ میں نہیں لائی گئی بھتی وہ اسی جنڈ کے نیچے پڑی رہی اور ساہیوں نے وہیں سے اٹھا کر دانا آباد میں دفن کی اور صاحباں کا بیاہ خان ظاہر سے کر دیا گیا تھا صاحباں نے سہاگ رات زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ اس بارے میں مستند تاریخ نہیں ملتی۔ شعراء کے قصے کہانیاں ہیں یا بھاٹوں کی زبانی روایتیں، تاہم اتنی بات درست ہے کہ مرزا صاحباں دونوں غیر طبعی موت کا شکار ہوئے۔ ان کی رومانی داستان کو سب سے پہلے پیلو شاعر نے نظم بند کیا۔ پیلو کے بارے میں روایت ہے کہ اس نے مرزا کو کھیوہ جانے سے روکا تھا اور کئی مثالیں دے کر صاحباں کو اغوا کرنے سے منع کیا تھا۔

پیلو کے بعد متعدد شعراء نے اس قصہ کو اپنے اپنے انداز میں لکھا۔ مرزا صاحباں کے قتل کے سلسلہ میں ایک اور کہانی اسی کتاب میں شامل ہے۔ مرزا صاحباں کے قتل کے بعد ماہنی سیالوں نے اپنی سُبکی اور تحقیر محسوس کرتے ہوئے دختر کشی کی رسم ڈالی۔ تمام سرداروں نے کھیوہ خان کے محل میں اعلان کیا کہ آئندہ ان کے خاندان میں جو بھی لڑکی پیدا ہوگی اسے زندہ دفن کر دیا جائے گا چنانچہ ماہنی سیالوں نے صاحباں کی وجہ سے ہونے والی سُبکی اور تحقیر سے بچنے کے لیے دختر کشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔

مغل تاجدار جہانگیر کے عہد میں صاحباں کا واقعہ پیش ہوا اور اسی عہد سے دختر کشی شروع ہوگئی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں اس رسم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی مگر حکومت وقت کو کامیابی نہ ہو سکی چنانچہ ۲۴۰ برس کے طویل عرصہ تک ماہنی اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے رہے ان ڈھائی صدیوں میں ہزاروں انسانی روحیں دنیا میں چند لمحوں کے لیے آئیں اور خلا میں گم ہوتی رہیں۔

۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے جھنگ پر قبضہ کیا تو یہ قبیح رسم جاری تھی۔ چنانچہ ڈپٹی کمشنر جھنگ جی ڈبلیو ہملٹن جو فروری ۱۸۵۰ء میں تعینات رہا اور بعد میں یعنی ۱۸۵۷ء میں کمشنر ملتان مقرر ہوا تھا نے اس رسم کو سختی سے روک دیا۔ ہملٹن نے ضلع بھر کی دائیوں کو پابند کر دیا تھا کہ ان کی نگرانی میں جس عورت کا بچہ پیدا ہو دائی کا فرض تھا کہ وہ علاقہ کے تھانیدار اور تحصیلدار کو اس کی اطلاع دے۔ حکام ان بچوں کے نام درج کرتے اور پھر اس ملک میں نام درج کرانے کا قانون نافذ ہو گیا ورنہ اس سے قبل نام درج کرانے کا کوئی قانون نہ تھا۔ ہملٹن نے جھوٹ بولنے والی دائیوں کو قید خانوں میں ڈالا اور سچی اطلاع دینے والی دائیوں کو انعامات دیئے چنانچہ جھنگ کے آس پاس انہی انعام یافتہ دائیوں کی اولاد کے پاس اراضی موجود تھی اب بیشتر فروخت ہو چکی ہے۔

ایک نگری دو راجے

سنہ ۱۱۶۳ھ

دنیا میں بعض واقعات ظہور میں آتے ہیں جنہیں تسلیم کرنے کے لئے دل و دماغ تیار نہیں ہو پاتے لیکن واقعات کی حقیقت اور سچائی اپنا وجود تاریخ میں تسلیم کرا لیتی ہے۔ ایک نگری دو راجے قطعی ان ہونی سی بات ہے اور پھر جب معاملہ اقتدار حکومت کا ہو تو اور بھی مشکل مرحلہ بن جاتا ہے مگر سرزمین جھنگ میں اس کا تجربہ ہوا گو یہ تجربہ ناکام رہا لیکن تجرباتی دور اپنے ساتھ مستقل یادداشتیں چھوڑ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مغل سلطنت زوال پذیر ہو رہی تھی اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود مختار ہو کر مغلوں کی سرپرستی سے آزاد ہوتی جا رہی تھیں۔ ریاستوں کی آزادی کی تحریک جھنگ تک بھی پہنچ گئی اس وقت جھنگ پر سیالوں کا تیرھواں حکمران نواب ولیداد خان سریرآرائے حکومت تھا۔ یاد رہے کہ جھنگ میں سیالوں کا پہلا حکمران نواب مل خان ہیر کا چچازاد بھائی نواب بہلول لودھی کے عہد گورنری پنجاب کے دوران برسر اقتدار آیا تھا۔

نواب ولیداد خان کو آس پاس کے نوابوں اور مہاراجوں نے اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ مغل حکمران کو خراج اور مالیہ کی خطیر رقم ادا نہ کرے بلکہ آزاد ہو جائے۔ مغل حکومت اب اس قابل نہیں رہی کہ وہ کسی ریاستی حکمران کے خلاف فوجی مہم کر سکے لیکن

نواب ولیداد خان نے ہمیشہ ان لوگوں کو ایک ہی جواب دیا کہ مغل سلطنت ہندوستان میں مرکز اسلام کی حیثیت رکھتی ہے میں محض چند ٹکوں کی خاطر اپنے مرکز سے بے وفائی نہیں کروں گا ولیداد خان کا یہ جذبہ قابل صد مبارک باد تھا یہی وجہ ہے کہ مورخین نے اسے فراخ دلی سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

نواب ولیداد خان ۱۱۶۳ھ میں انتقال کر گیا چونکہ اولاد نرینہ سے محروم تھا اس لئے جھنگ کی ریاست سے اس کی نسل ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔

ولیداد خان کی ایک لڑکی فتح بی بی تھی جس کی شادی اس نے اپنی زندگی میں اپنے حقیقی بھتیجے عنایت اللہ خان سے کر دی تھی جو براہیم خان کا بیٹا تھا (کوٹ براہیم تحصیل جھنگ اسی کا آباد کردہ ہے) ولیداد خان کی وفات کے بعد اکثر وزرا ریاست کا یہی خیال تھا کہ باپ کی گدی پر فتح بی بی کو بٹھا دیا جائے جو ولیداد ہی کی طرح سمجھدار بہادر اور رعایا پرور ہے لیکن فتح بی بی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ شریعت نے عورت کو امیر یا بادشاہ مقرر کرنے کی اجازت نہیں دی۔

دوسری طرف ولیداد خان کے دوسرے بھتیجے شہادت خان ولد شیر خان کی شادی عنایت اللہ خان کی حقیقی ہمشیرہ سے ہو چکی تھی اس خاندان کی دو شاخیں ولیداد کی جانشینی کی مستحق سمجھی جا رہی تھیں دو ماہ تک کاروبار ریاست فتح بی بی انجام دیتی رہی اور وزراء ریاست و خاندان کے سرکردہ افراد جانشینی کا مسئلہ سوچتے رہے۔

چنانچہ انہوں نے کافی سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ اس ریاست پر عنایت اللہ خان اور شہادت خان دونوں بیک وقت حکومت کریں گے تمام امور ریاست دونوں کے مشورہ سے طے ہوں گے اور تمام احکامات دونوں کے دستخطوں سے جاری ہوں گے۔

چنانچہ رؤسا اور امرا ریاست کے اس بالکل انوکھے نرالے فیصلہ کے مطابق

۱۱۶۳ھ شوال ہفتہ کے دن عنایت اللہ خان اور شہادت اللہ خان دونوں کو بیک وقت جھنگ کا حکمران بنانے کے لئے دربار عام کا اعلان ہوا جس میں دونوں کے سر پر تاج رکھے گئے۔ دونوں نے شاہی لباس پہنا دونوں تخت پر متمکن ہوئے۔ دونوں کو سرکاری انگوٹھیاں جن سے سرکاری احکامات پر مہریں لگائی جاتی تھیں پہنائی گئیں اور اس طرح دنیا میں پہلی اور شاید آخری بار یہ تجربہ عمل میں آیا کہ ایک نگری میں دو راجے کیسے حکومت کرتے ہیں۔ چنانچہ تین سال تک دونوں نے مشترکہ حکومت کی۔ دونوں بیک وقت دربار میں آتے۔ دونوں بیرونی سفرا سے ملاقات کرتے اور دونوں دیگر امور ملکی سرانجام دیتے۔ جھنگ کے سیالوں کی یہ حکومت دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بن گئی بیرونی حکومتیں جب سنتیں حیران ہو جاتیں اور حالات کا جائزہ لینے کیلئے اپنے قاصد روانہ کرتیں۔ تین برس ایک نگری کے دو راجے برسر اقتدار رہے ایک نیام میں عملاً دو تلواریں سما دی گئیں۔ لیکن یہ تجرباتی دور قطعاً مختصر ثابت ہوا۔ حاسدین کی نظر کھا گئی۔ شہادت خان نے بدگمانی میں پہل کی اور تخت سے از خود علیحدہ ہو کر فوج میں بغاوت پھیلائی۔ اپنے ہمنواؤں کو جمع کر کے چناب کے کنارے کا علاقہ آزاد کرا لیا اور نئی ریاست کا اعلان کر دیا۔ عنایت اللہ خان نے اس بغاوت کو فرو کرنے کیلئے خود فوج کی کمان سنبھالی۔ موضع سلطان پور کے قریب دونوں کی فوجوں میں گھمسان کا معرکہ ہوا جس میں شہادت خان زخمی ہو کر گرا اس کی فوج پسپا ہو گئی۔ شہادت خان زخموں سے چور کراہ رہا تھا اسے پانی کی شدید طلب ہوئی اس نے عنایت اللہ سے پانی مانگا۔ عنایت اللہ نے پانی کے بجائے شربت اس کے پاس بھجوا دیا جو شخص شربت لے کر پہنچا شہادت خاں نے اسے کہا وہ خود شربت لاتا تو میں باوجود زخمی ہونے کے اسے اپنی تلوار کا مزہ چکھاتا۔

شہادت خاں ۳ رمضان ۱۱۶۷ھ کو انہی زخموں کی وجہ سے جاں بحق ہو گیا اور اس طرح جھنگ کی ریاست کلی طور پر عنایت اللہ خان کی تحویل میں آ گئی۔



محر مالک

۱۹۱۴ء

بعض اوقات جاہل اجڈ اور ڈاکو قسم کے لوگ جن کے خلاف معاشرہ میں شدید نفرت و حقارت کے جذبات ہوتے ہیں معاشرہ کے کسی حصہ یا شعبہ کے لئے نجات دہندہ بن جاتے ہیں ان کے دلوں کی سنگینی اور منتقم مزاج کی برہمی مظلوموں کا سہارا بن کر انہیں خراب و خستہ حالات سے بچالیتی ہے۔ ہم اگر اپنے گردوپیش کی تاریخ کے صفحات الٹیں اور ان کے حواشی پر گہری نظر ڈالیں تو ہمیں اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ ڈاکو ولی کامل بن گئے اور ڈاکو مظلوموں کے لئے سایہ ثابت ہوئے۔

قصبہ نیکوکارہ احمد پور سیال تحصیل شورکوٹ کا محر مالک اپنے عہد کا جابر انسان تھا۔ قانون اس سے خوف کھاتا اور قانون کے محافظ اس کا نام سن کر کانپ جاتے تھے محر مالک قدوقامت کے اعتبار سے ہرگز ممتاز نہ تھا۔ ایک غریب کاشتکار والدین کا بیٹا تھا جس کی کل زرعی اراضی سات ایکڑ تھی۔ یہی اراضی اس کا وسیلہ معاش تھی اس کا اصل نام محرم تھا قوم لک جو راجپوتوں کی ایک گوت ہے سے تعلق رکھتا تھا۔ ضلع جھنگ میں لک قوم کے لوگ درمیانہ درجے کے زمیندار و کاشتکار ہیں اور مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔ محرم خان چاہ ہمی والا اسلام آباد موضع نیکوکارہ کا معمولی زمیندار تھا۔

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عالمگیر کے شروع میں ملتان، پنی رملک ایک مقدمہ کے

سلسلہ میں گیا اس کے پاس آمدورفت کا کرایہ نہ تھا۔ تین دن کی ضرورت کے مطابق گڑ کے شیرہ سے تیار ہونے والی میٹھی روٹیاں اس نے گھر سے پکوا کر پلے باندھ لیں اور پیدل ملتان روانہ ہوا۔ منزلیں مارتا جس وقت ملتان پہنچا سرکاری دفتر بند ہو چکے تھے اس کی کوئی جان پہچان نہ تھی اور نہ ہی اس کی غیرت نے یہ گوارا کیا کہ وہ کسی کا سہارا تلاش کرے عصر کے وقت ملتان کی مسجد سراجا نوالی میں آکر بیٹھ گیا۔ تھکا ہوا تھا مسجد کے ایک کونہ میں کپڑا تان کر ایسا سویا کہ عشا کی نماز ہو گئی اور مسجد میں وعظ شروع ہوا۔ محرم کو وعظوں اور جلسوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن مسجد کا صحن اندر اور باہر جب سامعین سے بھر گیا اور تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے۔ محرم کی آنکھ کھل گئی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بادل نخواستہ وعظ سننے لگا اسے معلوم نہ تھا کہ مولوی کون ہے اور وعظ کا مقصد کیا ہے مگر مولوی صاحب کی تقریر خالص ملتانی پنجابی لب و لہجہ میں تھی جس نے محرم کے دل پر گہرا اثر کیا۔ مولوی صاحب نے انگریزی حکومت کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ اس حکومت کے وفادار اور ساتھی ہیں وہ خدا کے مجرم ہیں۔ یہودیوں عیسائیوں سے مسلمانوں کا کوئی جوڑ نہیں۔ قرآن نے اس کی سخت ممانعت کی ہے۔ انگریزی حکومت ہمارے مسلمان بھائیوں کو پکڑ کر فوج میں بھیج رہی ہے۔ بڑے زمیندار اور وڈیرے اپنی کرسیوں کے لئے دیہاتی مسلمانوں کو حکومت کے پاس فروخت کر رہے ہیں ہر جگہ بھرتی کی مخالفت کرو۔ حکومت کو ٹیکس نہ دو۔ اور حکومت کا کوئی حکم نہ مانو۔ انگریز اور ہندو مسلمان کے دشمن ہیں ان پر قابو پاؤ تو ہرگز معاف نہ کرو۔

مولوی صاحب کے وعظ کا محرم نے اتنا اثر قبول کیا کہ وہیں مسجد میں بیٹھ کر اپنے دل سے عہد کیا کہ وہ حکومت کے کسی حکم کو تسلیم نہیں کرے گا وہ جس کام کے لئے ملتان گیا ہوا تھا چونکہ حکومت کے ایک افسر نے اسے طلب کر رکھا تھا اس نے دفتر جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا اور واپس لوٹ آیا چند ماہ اس نے مولوی کے وعظ کا خوب چرچا کیا۔

جہاں بیٹھتا اسی وعظ کی بات کرتا حکومت کی برائیاں کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کے خلاف تحصیلدار تک شکائتیں پہنچیں شروع ہوئیں۔ تحصیلدار نے تھانیدار کو حکم دیا کہ محرم خان کو کسی مقدمہ میں گرفتار کر لیا جائے ورنہ حکومت کے خلاف نفرت بڑھتی رہے گی۔ احمد پور سیال کے دو ہندو زرگروں نے تحصیلدار کے مشورہ سے اس کے خلاف چوری کا جھوٹا مقدمہ درج کرا دیا تھانیدار بھی ہندو۔ مدعی اور گواہ بھی ہندو۔ تحصیلدار بھی ہندو۔ محرم خان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ کسی مسلمان زمیندار کو حوصلہ نہ ہوا کہ وہ اس بے گناہ کی ضمانت دے۔ اس کی دو وجوہ تھیں پہلی وجہ حکومت کی مخالفت کا ان میں حوصلہ نہیں تھا اور دوسری بڑی وجہ ہندو ساہو کاروں کا دبدبہ تھا۔ مسلمان زمینداران ساہو کاروں کے مقروض تھے اور مسلمان ان کی دشمنی مول لینے کو تیار نہ تھے۔

چار ماہ محرم جیل میں رہا بالآخر مخدوم نذر حسین رئیس حسو بلیل کی سفارش پر اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ ضمانت پر رہائی کے بعد محرم میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ احمد پور کے ہندو ساہو کاروں کو جو مسلمانوں کا خون چوس رہے تھے بالکل بھوکا اور کنگال کر دے گا تاکہ ان کا غرور ٹوٹ جائے اور مسلمانوں سے وہ جس طرح نفرت کرتے ہیں اس کی ان کو سزا دی جائے تاکہ ان کو احساس ہو سکے کہ انسان سب برابر ہیں۔

محرم نے ڈاکوؤں کا ایک گروہ منظم کیا جس میں کل سات آدمی تھے ان میں تین ضلع مظفر گڑھ کے رہنے والے تھے اور چار علاقہ احمد پور سیال کے۔

محرم نے اپنے ساتھیوں کو دربار حضرت سلطان العارفین سلطان محمد باہو پر اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ مجھے کوئی دنیاوی لالچ نہیں ہے صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے غریب مسلمان جن کی زمینیں۔ مکان۔ زیورات حتیٰ کہ گھریلو سامان ان ہندو ساہو کاروں کے پاس رہن پڑا ہے۔ مسلمان ان کے غلام بن چکے ہیں ان میں قرضے ادا کرنے کی طاقت نہیں اور یہ ساہو کار ان مجبوریوں سے یہاں تک فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ان کی عورتوں سے توہین آمیز

مذاق کرتے اور ان کی غیرت کو للکارتے ہیں ۔ میں ان مظلوموں کا ان ظالم ساہوکاروں سے بدلہ لینا چاہتا ہوں اور جو کچھ ان سے ہم چھینیں گے اس میں میرا کوئی حصہ نہ ہوگا وہ سب کچھ تمہارا ہوگا تمہارا فرض یہ ہے کہ مظلوموں کے لئے اس میں حصہ مقرر کر دو، اور اس ولی اللہ کے مزار پر اس بات کا عہد کرو کہ ہم میں سے کوئی شخص حکومت کے پاس مخبری نہیں کرے گا اور مال جمع نہیں رکھے گا چنانچہ محرم کے ساتھیوں نے مزار پر کھڑے ہو کر یہ عہد کیا اور پھر یہ گروہ وارداتوں میں مصروف ہو گیا۔

محرم نے پہلا ڈاکہ احمد پور سیال کے رتن داس زرگر کے گھر پر ڈالا جس نے جھوٹا مقدمہ بنوا کر اسے جیل بھجوایا تھا ۔ اس ساہوکار کے مکان سے ۳۶ ہزار مالیت کے زیورات اور کرنسی نوٹ حاصل ہوئے ڈاکہ کامیاب رہا ملزم فرار ہو گئے اور پولیس ان کے نام تک معلوم کرنے میں ناکام رہی البتہ شبہ کی بنا پر پولیس نے محرم کی تلاش شروع کر دی لیکن وہ جنگل میں چھپ گیا۔ تین ماہ کے بعد دوسری واردات بھی اسی قصبہ میں ہوئی ۔ اس دفعہ ہندو ساہوکار نے مقابلہ میں رائفل سنبھال کر فائرنگ شروع کر دی مگر محرم اور اس کے ساتھی فائرنگ سے قبل ہی بھاگ چکے تھے ۔ قصبہ میں سنسنی پھیل گئی لوگ گھوڑوں پر سوار ڈاکوؤں کے تعاقب میں گئے لیکن ناکام رہے پولیس یہ مقدمہ بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکی ۔ ان دو بڑی وارداتوں کے بعد علاقہ کے ہندوؤں نے احمد پور سیال میں جلسہ کیا اور اس میں ہندو مہاسبھا کے ایک مقامی کارکن لالہ رام دتہ مل گندھو نے اپنی تقریر میں حکومت سے کہا کہ انگریزی حکومت کی وفادار رعایا صرف ہندو قوم ہے مسلمان اس کے وفادار نہیں ہو سکتے ۔

حکومت جو پہلے ہی جنگ کی وجہ سے خاصی مجبور ہو چکی ہے مسلمانوں نے اسے کئی مسائل میں الجھا دیا ہے اور حکومت کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر مسلمان زمیندار جو عموماً ہندوؤں کے مقروض ہیں لوٹ مار کی اس خفیہ تحریک کی حوصلہ افزائی

کر رہے ہیں اگر حکومت نے ہندو رعایا کی حفاظت نہ کی تو وہ ترک موالات پر مجبور ہو جائیں گے۔ ہندوؤں کے اس جلسہ میں احمد پور سیال کا تحصیلدار بھی شامل تھا جلسہ کی کاروائی اعلیٰ حکام تک پہنچی۔ ضلع کی پولیس حرکت میں آگئی۔ مسلمان زمینداروں کی جواب طلبیاں کی گئیں اور احمد پور سیال میں تعزیری چوکی بٹھا دی گئی۔ تعزیری چوکی کا مقصد یہ تھا کہ اگر اس گاؤں میں ڈکیتی یا سرقہ بالجبر کی کوئی واردات ہوئی تو علاقہ کے زمینداروں سے واردات کی کل مالیت بطور جرمانہ وصول کی جائے گی۔

حکومت کے اس فیصلہ سے مسلمان زمیندار سخت پریشان ہو گئے۔ گڑھ مہاراجہ کے رئیس نواب ذوالفقار خان نے مسلمان زمینداروں کو اپنے ڈیرہ پر بلایا حکومت کی تعزیری چوکی کے خلاف احتجاج کیا اور ڈکیتی کی وارداتوں سے اپنی بریت ظاہر کی۔ اس موقعہ پر مخدوم نذر حسین قریشی رئیس حسو بلیل نے بھی حکومت کو آگاہ کیا کہ وہ ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے مسلمان رعایا پر ظلم کر رہی ہے اور ہندو مسلم اختلاف بڑھانا چاہتی ہے اگر تعزیری چوکی نہ اٹھائی گئی تو مسلمان زمیندار حکومت کو مالیہ اور دیگر واجبات ادا نہیں کریں گے اس سلسلہ میں مسلمان زمینداروں کا ایک وفد ڈپٹی کمشنر سے بھی ملا اور اپنا موقف اس پر واضح کیا۔ ان دنوں حکومت عالمی جنگ کی وجہ سے سخت پریشان تھی اور ہندوستان میں آزادی کی تحریک پنپ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے لئے سہ گونہ پریشانی پیدا ہو گئی تھی، بھرتی اور چندہ کی مہم رک گئی۔ ہندو مسلم اختلافات نفرت کی حد تک بڑھ گئے۔ ہندو اپنی جگہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے اور مسلمان اپنی جگہ پر، حکومت نے چھ ماہ تک سوچ بچار جاری رکھا اور چھ ماہ تک تعزیری چوکی قائم رہی مگر اس دوران لوٹ مار کی کوئی واردات نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد چوکی اٹھالی گئی اور ہندو مسلمانوں پر مشتمل امن کمیٹیاں قائم کر دی گئیں لیکن دونوں قوموں کے دلوں میں نفرت کے جذبات ختم نہ ہو سکے۔

محرم لک اور اس کے ساتھی حالات کا جائزہ لیتے رہے انہوں نے اس عرصہ میں کوئی واردات نہ کی۔ ضلعی انتظامیہ حالات سے مطمئن ہوئی تھی کہ اچانک ایک چنگاری پھر سلگ اٹھی جس نے ساحل چناب کی پچاس میل لمبی پٹی کے امن و سکون کو تہس نہس کر دیا، گویا ماچھیوال سے لے کر احمد پور سیال تک کچھی اور دہمن کا علاقہ آگ و خون کی لپیٹ میں آگیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ ولیداد نامی ایک معمولی زمیندار نے اپنی زندگی میں ایک ہندو ساہوکار سے دو سو روپیہ قرض سالانہ سود پر لیا تھا جسے تین سال گزر گئے ولیداد قرض اتارے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ کچھ سرکاری مالیہ اس کے ذمہ تھا۔ تحصیلدار نے اس کی اراضی مالیہ کے عوض قرق کرالی۔ پیروی کرنے والی صرف اس کی بیوہ نعامت تھی جو جسم و قامت اور چہرہ بشرہ کے اعتبار سے خاصی قبول صورت تھی۔ وہ جب قصبہ کے اس دکاندار کے سامنے سے گزرتی وہ اسے روک کر قرض کا تقاضا کرتا۔ نعامت اپنی مجبوریاں ظاہر کر کے مہلت مانگ لیتی۔ جب دکاندار کا تقاضا بڑھ گیا اور معاملہ تلخ کلامی تک پہنچا تو اس غیرت مند خاتون نے جواب دیا کہ میرے پاس نقدی یا سونا چاندی نہیں زمین تھی وہ سرکار نے قرق کر لی ہے ایک گائے میرے پاس ہے وہ تم قرض کے عوض لے سکتے ہو۔ خاتون کی اس پیشکش کے جواب میں ہندو ساہوکار نے فوراً کہا۔ مجھے چارہ کھانے والی گائے نہیں چاہئے روٹی کھانے والی گائے چاہیئے جس کی دو ٹانگیں ہوں"۔

ہندو دکاندار کا اشارہ براہ راست نعامت کی طرف تھا وہ مقروض اور مجبور ہونے کے باوجود دکاندار سے الجھ پڑی اور سر بازار اس کی پٹائی کر دی۔ یہ واقعہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا اور ہندو مسلم سوال اس شدت سے ابھرا کہ اس کا تھامنا حکومت کے بس کی بات نہ رہی تجارت پر چونکہ ہندوؤں کا قبضہ تھا انہوں نے مسلمانوں سے لین دین بند کر دیا۔ یہ سوشل مقاطعہ دس پندرہ دن تک جاری رہا۔ امن کمیٹیاں ناکام ہو گئیں۔

محرم لک کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے اپنے گروہ کے افراد بلائے اور ان سے کہا

کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے لہذا کوئی ہندو اب ہماری دسترس سے نہ بچنا چاہیئے۔ محرم کے گروہ نے دیہاتوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ ہندو عورتوں کو پکڑ لیتے ان کے گلے میں گھنٹیاں باندھ کر نچاتے ان کی منڈیاں لگاتے اور فروخت کرتے اس طرح مسلسل کئی روز تک تریموہیڈ سے لے کر رنگ پور ضلع مظفر گڑھ تک ساحل چناب کے مشرقی حصہ کے تمام دیہاتوں میں لوٹ مار کی ایسی زبردست مہم شروع ہوئی کہ پولیس اور انتظامیہ مقابلہ کی تاب نہ لاکر بے بس ہو گئی۔ مسلمان گروہ در گروہ دیہاتوں میں گھس جاتے اور ہندوؤں کے گھر لوٹ لیتے جو ہندو مزاحمت کرتا اس کے گھر کی لڑکیاں تک اٹھالی جاتیں یہ لوٹ مار پندرہ بیس دن تک جاری رہی۔ سینکڑوں ہندو قتل ہوئے عورتیں اغوا ہوئیں اور لاکھوں روپیہ نقد۔ زیورات ہیرے جواہرات اور قیمتی سامان۔ مال مویشی مسلمانوں نے محرم لک کی قیادت میں لوٹا۔ ہر گاؤں میں سونا چاندی پگھلانے کی خفیہ بھٹیاں لگائی گئیں، موقع پر زیورات گلا دیئے جاتے۔ مویشی کاٹ کر کھائے جاتے۔ لوٹ مار کا دائرہ جھنگ صدر تک بڑھ آیا۔ پنجاب بھر کے ہندوؤں نے احتجاجی ہڑتالیں کیں۔ گورنر اور وزراء کو وفود ملے۔ پنجاب اسمبلی میں معاملہ زیر بحث آیا۔ بالآخر صوبائی حکومت نے ساحل چناب کا علاقہ فوج کے حوالہ کر دیا۔ فوج نے نظم و نسق سنبھالنے کے بعد امن کی راہیں تلاش کیں مگر ۸۰ فیصد ہندو خوفزدہ ہو کر ترک سکونت کر گئے۔ ان کی بیٹیاں، بہنیں، بیویاں؟ غائب ہو گئیں۔ یہاں تک کہ ان عورتوں کو مسلمانوں کے دیہاتوں میں لے جا کر سر عام نیلام کیا جاتا اور مسلمان مقروضوں پر کئے گئے مظالم کا اس طرح بدلہ لیا گیا۔

فوج آنے سے قبل محرم لک کو خبر ملی کہ اس کا گروہ ایک ایسے ہندو کے گھر ڈاکہ ڈالنے کے لئے جا رہا ہے جس کے گھر محرم نے ایک دفعہ پناہ لی تھی۔ محرم اس ہندو کے مکان پر پہلے ہی پہنچ گیا جونہی وہ گروہ اس کے گھر میں فائرنگ کرتے ہوا داخل ہوا۔ محرم نے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں کو للکارا اور مکان سے چلے جانے کی ہدایت کی۔ کچھ وقت تک ڈاکو اپنی ضد پر اڑے رہے مگر محرم لک ڈاکوؤں کو واپس

لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

فوج کی آمد پر لوٹ مار کی وارداتیں رک گئیں۔ دراصل اس ساحلی پٹی پر کسی ہندو ساہوکار کا گھرانہ ایسا نہ تھا جہاں لٹیروں کے قدم نہ گئے تھے اب اس علاقہ میں کوئی ہندو دولت مند باقی نہ رہا تھا ان کی اکثریت لٹ چکی تھی اور باقی جان بچاکر یہاں سے نکل گئے تھے لہذا لٹیروں کی سرگرمیاں از خود ختم ہوگئیں۔ سرکردہ ڈاکو روپوش ہوگئے۔ ہندو خوف کے مارے اپنے گھروں میں واپس آنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ مسلمان زمینداروں سے حکومت کا رویہ مخاصمانہ ہوگیا چنانچہ فوج نے لٹیروں کی گرفتاری کے احکامات جاری کئے اور یہ اعلان بھی کیا کہ جو ان کو پناہ دے گا اس کی جائیداد ضبط کرلی جائے گی مجرموں کے خلاف مقدمات کی سماعت کے لئے خصوصی فوجی ٹربیونل بنایا گیا جس کا سربراہ عبدالغفور خان سپیشل جج ملتان تھا اس نے مارچ ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ ہائی سکول جھنگ صدر کے ہال میں مقدمات کی سماعت کی۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق اس لوٹ مار میں کل ۴۲۸، افراد ملوث پائے گئے ان ملزمان میں محرم لک کی محبوبہ جنداں بھی شامل تھی۔

پولیس کے مطابق جنداں نہ صرف مردانہ لباس پہن کر ڈکیتی کی وارداتوں میں شامل رہتی بلکہ اپنے گروہ کو ہندوؤں کے حالات و کوائف سے بھی باخبر رکھتی تھی۔ ۱۹۴ افراد پولیس اور فوج نے گرفتار کر لئے ان کو ٹربیونل کے روبرو پیش کیا گیا۔ مسلمان وکلا صفائی کی طرف سے پیش ہوئے اور ہندو وکلا استغاثہ کی طرف سے۔ ٹربیونل کی کارروائی لاہور کے ہندو اخبارات پرتاب۔ ملاپ میں شائع ہوئی۔ جس سے پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے لوگوں کو بھی ان واقعات سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔

ٹربیونل نے اس گروہ کے سرغنہ محرم اور دیگر ۸۰ روپوش ملزمان کو اشتہاری قرار دیدیا۔ محرم کی گرفتاری کے لئے پانچ ہزار روپیہ نقد اور دو مربع اراضی انعام دینے کا بھی اعلان کیا۔ محرم لک اور اس کی داشتہ جنداں مین ماہ مخدوم نذر حسین رئیس

حسو بلیل کے ہاں روپوش رہے، اسی دوران کچھ مسلمان زمینداروں نے نقدی اور انعام کے لالچ میں محرم لک کی تلاش شروع کی۔ ۵، ۷ مجرمان اشتہاری بعد میں گرفتار ہوئے۔ پانچ ایسے روپوش ہوئے کہ آخر تک ان کا پتہ نہ چل سکا۔

محرم لک کا ایک ساتھی سجادل علیانہ محرم کی داشتہ پر نظر رکھتا تھا اور اس نے جنداں پر کئی بار ڈورے بھی ڈالے تھے لیکن جنداں اس کے قابو نہ آئی تھی۔ سجادل علیانہ کو چونکہ محرم لک اور جنداں کے بارے میں علم تھا لہذا سجادل علیانہ از خود پولیس کے روبرو پیش ہوگیا اور اس نے وعدہ معاف گواہ بن کر تمام حالات سے پولیس اور ٹربیونل کو آگاہ کر کے محرم لک کی مخبری کر دی کہ وہ مخدوم نذر حسین کے ہاں روپوش ہے۔ چنانچہ فوجی اور پولیس حکام نے حسو بلیل میں اچانک چھاپہ مارا مگر وہ محرم یا اس کی داشتہ کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے محرم اپنی داشتہ کو لے کر پہلے ہی نواب ذوالفقار خان رئیس گڑھ مہاراجہ کے ہاں پناہ لے چکا تھا چھاپہ ناکام ہونے پر حکومت کو خاصی شرمندگی اٹھانی پڑی پھر اسی وعدہ معاف گواہ نے نواب ذوالفقار خان کی مخبری کی کہ محرم لک اس کی پناہ میں ہے مگر محرم اپنی داشتہ کو لے کر یہاں سے ملتان کے قصبہ لودھراں کے ایک رئیس لنگو خان دئیس کے ہاں چلا گیا اور چھپ گیا۔

پولیس اور فوج کے حکام محرم اور اس کے ساتھیوں کی روپوشی سے سخت پریشان تھے حکام نے ضلع کے بااثر زمینداروں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور ان کو انعام واکرام کا لالچ دیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کو محرم کی پناہ گاہ کی خبر تھی وہ اسے باوجود لالچ کے محض حکومت دشمنی کی بنا پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تین ماہ اسی کوشش میں گزر گئے۔ اس دوران شور کوٹ کے ایک قریشی نے جو معمولی زمیندار تھا (لیکن آجکل اس کی اولاد روساء میں شمار ہوتی ہے اور اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز رہی) نے ڈپٹی کمشنر جھنگ کے پاس رات کے وقت اس کی کوٹھی آ کر محرم اور اس کے ساتھیوں کی مخبری کر دی کہ وہ لودھراں

کے زمیندار لگو خان کی پناہ میں ہے چنانچہ اسی وقت فوج اور پولیس کی گاردیں فراہم کی گئیں ادھر ملتان پولیس کو اطلاع کی گئی چنانچہ ملتان پولیس نے جھنگ پولیس سے پہلے پہنچ کر لگو خان کے مکان، ڈیرہ اور مختلف راستوں پر پہرہ بٹھا دیا۔ ملتان پولیس علی الصبح لودھراں پہنچ گئی تھی لیکن پولیس انچارج نے لگو خان کو اصل صورت حال سے مطلع نہ کیا بلکہ نہایت ہوشیاری سے اسے اپنے حلقہ میں لے لیا۔ دوسرے دن صبح ۹ بجے جھنگ سے پولیس اور فوج بھی موقع پر پہنچ گئی اور حکام نے لگو خان سے کہا کہ تم خود کو گرفتار سمجھو کیونکہ تم نے محرم اور اس کے ساتھیوں کو جو اشتہاری مجرم ہیں پناہ دے رکھی ہے۔ لگو خاں کے ڈیرہ پر ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اس کی ایک ملازمہ نے محرم اور اس کی داشتہ کو اطلاع کر دی وہ لگو خان کے ڈیرہ اور گھر سے کچھ فاصلہ پر ایک مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ محرم نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا اور اسلحہ لے کر مقابلہ کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ آٹھ افراد مکان کے مختلف کونوں میں چھپ کر بیٹھ گئے اس دوران لگو خاں پولیس حکام کے ہمراہ مکان کی نشاندہی کرانے کیلئے وہاں پہنچا مکان اندر سے بند تھا۔ لگو خان نے محرم اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ سارا گاؤں پولیس نے گھیر لیا ہے تمہارے بھاگنے کی کوئی گنجائش نہیں فوراً ہتھیار ڈال دو اور گرفتاری کے لئے پیش ہو جاؤ لیکن مکان کے اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ پندرہ منٹ حکام نے توقف کیا اور پھر پولیس کو فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔ پولیس فائرنگ کرتی اور مکان کی طرف بڑھتی گئی جب وہ مکان کے نزدیک پہنچ گئی تو محرم نے جوابی فائرنگ شروع کرا دی۔ دونوں طرف نصف گھنٹہ گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ اس دوران تین پولیس کانسٹیبل گولیاں لگنے سے ڈھیر ہو گئے۔ پولیس مکان کی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئی۔ محرم کے ساتھیوں کے پاس کارتوس ختم ہو چکے تھے۔ اس کی داشتہ جنداں ڈیوڑھی میں مورچہ بنائے کھڑی تھی جب پولیس اور فوجی حکام مکان کے اندر داخل

ہو گئے تو ایک افسر نے محرم خاں کو تاک کر فائر کرنا چاہا مگر اس دوران جنداں نے اسے گولی مار کر وہیں ڈھیر کر دیا۔ محرم نے اپنا مورچہ چھوڑ دیا اور رینگ رینگ کر جنداں کی طرف جانے لگا اس دوران پولیس نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن محرم کو کوئی گزند نہیں پہنچا البتہ اس کی داشتہ اور لکھو خان کی ملازمہ گولیاں لگنے سے موقع پر ڈھیر ہو گئیں۔ اب محرم تنہا تھا اس کے ساتھیوں میں سے پانچ مر چکے تھے اور تین پولیس کی تحویل میں آ گئے تھے۔ محرم نے ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر بندوق بلند کرتے ہوئے کہا میں اپنا ہتھیار پھینک رہا ہوں۔ چنانچہ اس نے بندوق پولیس کی طرف پھینک دی اور خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ محرم کے پاس کوئی کارتوس نہیں تھا ورنہ وہ مزید وقت مقابلہ جاری رکھتا۔

پولیس اسے گرفتار کر کے جھنگ لائی اور ٹربیونل کے روبرو پیش کر دیا۔ سات دن مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ مسلمان وکلا نے ہندو ساہوکاروں کی زیادتیوں کو ان تمام واقعات کا مورد گردانا۔ ٹربیونل نے چار سو کے قریب ملزمان کو دو ماہ سے تین سال تک مختلف میعاد کی سزائیں سنائی۔ محرم کو قتل ڈکیتی اور خونریزی کا مجرم اول قرار دیتے ہوئے سزا ئے موت کا حکم دینا چاہتا تھا لیکن ہندو مسلم سوال اور نفرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے عمر قید اور دس ہزار روپیہ جرمانہ کا حکم دیا۔

ٹربیونل نے محرم کے مقدمہ میں تمام واقعات پر بحث کرتے ہوئے مخدوم نذر حسین رئیس حسو بلیل اور نواب ذوالفقار خان رئیس گڑھ مہاراجہ کو بھی مجرم گردانتے ہوئے دونوں کو جلا وطنی کی سزائیں دیں چنانچہ نواب ذوالفقار علی خاں کو ضلع حصار میں اور مخدوم نذر حسین کو ضلع کانگڑہ میں ایک سال کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔

ساحل چناب کے بیشتر مسلمان زمیندار اس مقدمہ میں سزایاب ہوئے۔ لشاری کے مولوی غلام حسین۔ بستی سلطان لشاری کے اسماعیل خاں کو سات سال قید اور رشید لوکہ

کے نصرت اسلام خان وغیرہ قید کر لئے گئے۔ محرم خان کی اراضی جرمانہ کے عوض قرق کر لی گئی۔ محرم کچھ عرصہ جھنگ اور ملتان جیل میں رہا۔ ۱۹۲۱ء میں اسے لاہور جیل منتقل کر دیا گیا جہاں ۱۹۱۹ء کے واقعہ جلیانوالہ باغ کے سیاسی مجرم قید تھے۔ چنانچہ محرم نے ان قیدیوں کو ساتھ ملا کر لاہور جیل میں بغاوت کر دی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور کئی ملازمین کو زخمی کر دیا۔ فوج نے بغاوت فرد کرنے کے لئے فائرنگ کی۔ اس فائرنگ میں محرم بری طرح زخمی ہوا اور ان ہی زخموں کی وجہ سے لاہور جیل میں جاں بحق ہو گیا۔

محرم ملک کا نام ساحل چناب کے لوگوں میں خوف کی علامت بن چکا تھا ہندو عورتیں اپنے بچوں کو محرما ملک کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں اور مسلمانوں میں محرم کی بہادری و شجاعت کے واقعات لوک گیتوں، ڈھولوں اور ماہیا میں بیان کئے جانے لگے۔ اس علاقہ میں آج بھی محرما ملک ایک کہانی کا عنوان ہے۔

اس کے دو بیٹوں سعید اور جیونہ کی اولاد آج بھی موجود ہے۔



مراد فتیانہ

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کا مجاہد

مراد تاریخ آزادیٔ وطن کا عظیم مجاہد تھا جس نے بادشاہ ظفر کی حمایت اور انگریز کی مخالفت میں وہ کارنامہ انجام دیا جس کے لئے آج بھی تاریخ کے صفحات اس کی خدمت میں ہدیہ تحسین پیش کرتے ہیں۔

مراد فتیانہ کا جد اعلیٰ رار سیال تھا جو حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے دست حق پرست پر مسلمان ہوا۔ اور حضرت بابا نے ہی ان کی شادی اپنی مرید قوم میکن کی ایک عورت سے کی۔ میکن قوم بھکر اور حیدر آباد پر حکمران تھی اس قوم نے اپنے داماد رار سیال کو جاگیر دی جو دریا جہلم کے غربی کنارے پر تھی۔ اس وقت سیال قوم کی کم و بیش ایک سو شاخیں موجود ہیں جو سیال کہلانے کے ساتھ اپنے باپ کے نام سے منسوب ہیں۔ رار سیال کی اولاد میں بارھویں پشت پر ماہنی سیالوں میں ایک شخص فتا گزرا ہے جس کی اولاد فتیانہ مشہور ہے فتیانہ سیال جھنگ کے علاوہ اس وقت ضلع لائلپور۔ کمالیہ اور سرگودھا میں بھی آباد ہیں چونکہ یہ تمام علاقے سنہ ۱۹۰۱ء سے قبل ضلع جھنگ کی حدود میں شامل تھے بعد میں برطانوی حکومت نے جھنگ کے مختلف حصے کر دیئے۔ منٹگمری، ساہیوال اور لائلپور اسی ضلع کو کاٹ کر علیحدہ اضلاع بنائے گئے۔

مراد ولد دلیل فتیانہ راوی اور چناب کے دوآبہ کا زمیندار تھا اور بہادر شاہ ظفر آخری مغل تاجدار کا انتہائی وفادار۔ مراد کا نواب احمد خاں کھرل سے قلبی تعلق تھا۔ مراد کی جوانمردی

کے واقعات کی ترتیب میں نواب احمد خان کھرل کی شخصیت کے خدوخال نمایاں ملتے ہیں۔ مورخین نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات بیان کرتے ہوئے احمد خان کھرل کو نمایاں مقام دیا مگر احمد خان کی موت کا بدلہ لینے والے اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ایس برکلے کو موت کے گھاٹ اتارنے والے مراد فتیانہ کا صرف نام لکھنے پر اکتفا کیا اس کے علاوہ مذکورہ جنگ آزادی کے وقائع نگاروں نے اہل پنجاب سے مجموعی طور پر انصاف نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں نے انگریزی حکومت کی بالعموم حمایت کی اور مسلمان نیم دروں نیم بروں رہے لیکن جن مسلمان مجاہدین نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا فرنگیوں کی فوجی چھاؤنیاں تباہ کیں، اعلیٰ افسر قتل کئے اور خود بہادری سے جام شہادت نوش کیا ان کے واقعات سے صرف نظر کرنا مورخین و تذکرہ نویسوں کی کوتاہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وقائع نگاروں کو ان کے تفصیلی حالات نہ مل سکے ہوں لیکن آج ہم ان کوتاہیوں کی تلافی کر سکتے ہیں اور تاریخ کے ان جیالوں کو خراج تحسین پیش کر کے سرخرو ہو سکتے ہیں۔

ستمبر ۱۸۵۷ء کو جھنگ سیالوں اور کمالیہ کے کھرلوں کو نواب احمد خان کھرل نے راوی کے اس پار یعنی راوی اور چناب کے دوآبہ میں جہاں پر انگریزوں نے گوگیرہ کے پاس اپنی اہم فوجی چھاؤنی قائم کی تھی۔ گھنے جنگل میں جمع کیا اس اجتماع میں احمد خان کے علاوہ مراد فتیانہ۔ صلابت۔ ولی داد۔ مروانا اور بھری جو علاقہ کے نمائندہ اور سرکردہ لوگ شمار ہوتے تھے جمع ہوئے۔ نواب احمد خاں نے پہلے ان لوگوں سے بہادر شاہ ظفر کی وفاداری کا حلف لیا اور پھر ان کے ذمہ مختلف فرائض لگائے جن میں فرنگیوں کی نقل و حرکت کی مکمل اطلاعات۔ فرنگیوں کی ڈاک کے نظام کو درہم برہم کرنا۔ ان مسلمانوں کو جو فرنگیوں کی حمایت کر رہے تھے راہ راست پر لانا۔ مجاہدین کے لئے سامان رسد، خوراک اسلحہ اور روپیہ فراہم کرنا وغیرہ شامل تھا۔ نواب احمد یار خان کھرل کو ان نمائندوں نے اپنا

سربراہ اور سالار تسلیم کر کے اس کی قیادت میں جہاد کرنے کا فیصلہ کیا اور فرائض مفوضہ کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔ ۶ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو یہ اہم اجتماع ہوا اور تیسرے دن مجاہدین کی بھرتی شروع کر دی گئی۔ اتفاق سے فرنگیوں کا ہیڈکوارٹر قصبہ گوگیرہ تھا اور مجاہدین نے بھی اس سے تھوڑے فاصلہ پر جنگل میں اپنا مرکز قائم کر دیا۔

انگریزی حکومت کے ملازمین جس شخص کے بارے میں شبہ محسوس کرتے اُسے بلا تامل گرفتار کر کے گوگیرہ جیل میں ڈال دیتے۔ دیہاتیوں میں فرنگیوں نے خوف وہراس پیدا کیا ہوا تھا اکثر لوگ جنگلوں میں رہتے ان کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ فرنگیوں سے لڑنے کی طاقت نہ رکھتے تھے مگر ان کی ہمنوائی بھی جذبہ ایمان کے منافی سمجھتے تھے۔ ان کے جذبہ ایمانی کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ فرنگیوں نے جھنگ کمالیہ اور ساہیوال کے کچھ مجاہدین کو جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی ماہ جون میں پکڑ لیا اور گوگیرہ جیل میں بند کر دیا ان قیدیوں سے توہین آمیز سلوک کیا جاتا رہا۔ جب نواب احمد خان کو کسی ذریعہ سے اطلاع ملی تو وہ جیل میں بلا اجازت داخل ہو گیا اور قیدیوں کو کھانے پینے کی اشیاء وافر مقدار میں دے آیا۔ دوسرے دن ڈپٹی کمشنر جھنگ ایچ ایس ہارکو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے داروغہ جیل کو طلب کر لیا اور اسے سرزنش کی۔ داروغہ جیل مسلمان تھا اس نے فوراً جواب دیا احمد خان کھرل اس علاقہ کا بادشاہ ہے مجھ میں طاقت نہیں کہ اسے روک سکوں۔ ڈپٹی کمشنر نے داروغہ جیل کو معطل کر دیا اور اس کی جگہ ایک سکھ کو جیل کا انچارج بنا دیا۔ جس نے قیدیوں پر سختی شروع کر دی۔ ان قیدیوں کا سردار مراد فتیانہ کا حقیقی ماموں دلاور تھا اس نے قیدیوں سے بغاوت کرا دی۔ اس ہنگامہ میں جیل کا تمام نظام درہم برہم ہو گیا سکھ داروغہ نے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر برکلے کے مشورہ سے باغی قیدیوں پر فائرنگ کی جس سے واقعہ کی نوعیت زیادہ سنگین ہو گئی۔ باوجود کہ فرنگیوں کے پاس خاصی

قوت بھی اسلحہ بارود بھی وافر موجود تھا۔ آس پاس کے مسلمانوں نے ہمت کر کے رات کے وقت جیل پر حملہ کر دیا۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھالیں اور قیدیوں کو آزاد کرا لیا

۲۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو جھنگ کے ڈپٹی کمشنر کو مسٹر برکلے نے حالات سے آگاہ کیا۔ اس نے نواب احمد خاں کھرل کو نظر بند کر دیا اور حکم دیا کہ فوجی افسر کی اجازت کے بغیر وہ گوگیرہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس حکم کے خلاف پہلی بغاوت مراد فتیانہ نے کی۔ مراد نے گاؤں گاؤں گھوم کر جتھے فراہم کئے اسلحہ حاصل کیا اور فرنگیوں کے ٹھکانوں پر شب خون مارنے شروع کر دیئے۔ مراد فتیانہ نے شور کوٹ سے کمالیہ تک چاروں طرف مجاہدین لگا دیئے جو ہر لمحہ کی خبریں اسے مہیا کرتے اور فرنگیوں کی ڈاک کے تھیلے لوٹ لوٹ کر اس کے پاس پہنچاتے تھے۔ بغاوت جب پوری طاقت سے پھیل گئی تو فوجی حکام نے ایک گہری چال چلی اور نواب احمد خان کھرل کو رہا کر دیا تاکہ جو مسلمان اس کی نظر بندی کی وجہ سے برانگیختہ ہو چکے ہیں ان کے جذبات ٹھنڈے ہو جائیں مگر مشہور یہ کیا کہ ان کے خلاف جیل میں ہنگامہ کرانے کا پورا ثبوت مہیا نہیں ہو سکا۔ نواب احمد خان کھرل نے رہائی کے بعد مختلف قبیلوں کے امراء کو ساتھ ملا کر دہلی کی طرف مجاہدین بھجوانے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ مجاہد ملتان اور بہاولپور عبور کر کے دہلی جانے لگے۔ فرنگیوں کا متعدد مرتبہ ان سے مقابلہ ہوا مگر مجاہدین جنگلوں اور صحراؤں میں چھپتے چھپاتے منزل کی طرف بڑھتے رہے ایک طرف یہ صورت حال تھی۔ دوسری طرف احمد خان نے گوگیرہ کی چھاؤنی پر حملہ کرنے کا اعلان کر دیا اور بھاری جمعیت لے کر گوگیرہ کے قریب جنگل میں قریباً چار سو گز کے فاصلہ پر اپنے مورچے قائم کر لئے۔ فرنگیوں نے اس متوقع حملہ کے پیش نظر لاہور اور ملتان سے مزید فوجی پلٹنیں منگوائیں چنانچہ دونوں کے درمیان زبردست مقابلہ شروع ہوا۔ مجاہدین کی قیادت مراد فتیانہ کر رہا تھا اور فرنگیوں کا کمانڈر برکلے تھا۔ مجاہدین کے پاس

چند بندوقیں تھیں باقی لاٹھیاں۔ نیزے برچھیاں تلواریں وغیرہ تھیں جبکہ فرنگی توپوں اور دستی بموں سے لیس تھے۔ برکلے نے مجاہدین کی پیش قدمی رفر کرنے کیلئے توپوں کے منہ کھول دیئے اور دستی بم استعمال کئے۔ مجاہدین مخالف کی قوت کا جواب نہ دے سکتے تھے انہوں نے یہ چال چلی کہ آہستہ آہستہ گھنے جنگل کی طرف بڑھنے لگے۔ جب فرنگی گھنے جنگل میں پہنچ گئے تو مجاہدین نے جو بیشتر ادھر اُدھر چھپے ہوئے تھے ان پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا اور ان کے دستی بموں و توپوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کے سینکڑوں سپاہیوں کو ہلاک و زخمی کیا۔ فرنگی بدحواس ہو کر بھاگے اور بہت سا اسلحہ مجاہدین کے قبضہ میں آگیا۔ مجاہدین جنگل عبور کر کے موضع فتح پور میں روپوش ہو گئے مگر سرفراز خان کھرل نے ان کی ڈپٹی کمشنر کے ہاں مخبری کر دی اور اس کے صلہ میں جاگیر حاصل کی۔

۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو فرنگیوں اور مجاہدین کے درمیان موضع فتح پور کے قریب ساحل راوی پر پھر زبردست مقابلہ ہوا جس میں انگریزی فوج نے شکست کھائی اور پسپا ہو کر لوٹ آئی۔ مجاہدین مطمئن تھے کہ اب یہ علاقہ فرنگیوں سے خالی ہو جائے گا کہ مجاہدین میں سے ایک غدار بابا بھیم سنگھ بیدی نے مخبری کر کے برکلے کو جنگل عبور کرنے اور مجاہدین پر رات کے وقت اچانک حملہ کرنے کا راستہ بتایا دوسرے دن یعنی ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو برکلے نے اچانک حملہ کر کے مجاہدین کو گھیرے میں لے لیا۔ نواب احمد خاں کھرل اس حملہ میں شہید ہو گیا جس کا مجاہدین کو سخت رنج پہنچا کچھ مجاہدین پسپا ہو کر گرفتار ہو گئے کچھ بھاگ نکلے۔ مراد فتیانہ نے اپنے سردار کے خون کا بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا اور جنگل میں چند ساتھیوں سمیت چھپ گیا۔

برکلے نے نواب احمد خان کی شہادت پر جشن منایا لاہور اور ملتان تک خصوصی قاصد دوڑائے کہ برطانوی حکومت کا باغی قتل ہو چکا ہے اب اس علاقہ میں بغاوت فرو

ہو جائے گی اور جلد ہی تمام علاقہ زیر ہو جائے گا۔

برکلے فتح و خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا جنگل عبور کر کے گوگیرہ کی طرف واپس آ رہا تھا کہ مراد فتیانہ جس نے دل سے عہد کیا تھا کہ وہ اس ظالم انگریز کو قتل کرے گا کیونکہ اس نے نواب احمد خان کا خون کیا تھا۔

مراد نے صرف تیس جانبازوں کی ایک جماعت کے ذریعے برکلے کا تعاقب کیا اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر جنگل میں اس کے پیچھے چلتا رہا۔

برکلے کی فوج نے موضع کوڑے شاہ اور دریائے راوی کے کنارے کے درمیان پہنچ کر بیٹ میں قیام کیا وہ مطمئن تھا کہ اب کسی کو ادھر آنے کی جرأت نہیں ہو گی لیکن چند ہی لمحوں بعد بڑے بڑے سرکنڈوں سے باہر نکل کر مراد فتیانہ نے برکلے کو للکارا، "او فرنگی میں موت کی طرح تیرے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں خبردار بندوق کی طرف ہاتھ نہ اٹھانا اس جنگل کے ہر سرکنڈے کے پیچھے مجاہدین مسلح بیٹھے ہیں اور وہ تمہارے سپاہیوں کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔ مجاہدین نواب احمد خان کھرل کے خون کا بدلہ لینے آئے ہیں" برکلے اس اچانک حملہ سے بدحواس ہو گیا اس نے اپنی فوج کو فائر کھولنے کا حکم دیا مگر اس سے قبل کہ اس کی بٹالین اپنا اسلحہ سنبھالتی، مجاہدین نے آگے بڑھ کر ان میں سے بیشتر کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔ اب برکلے تنہا تھا اس کے پاس دستی بم تھے جو اس نے مجاہدین کی طرف پھینکے مگر مجاہدین نے اس کا گھیرا تنگ کر دیا۔ برکلے نے اپنی بندوق سے فائر شروع کئے ابھی بندوق اس کے ہاتھ ہی میں تھی کہ مراد نے بڑھ کر اس زور سے اس کے سینہ میں نیزہ پیوست کر دیا کہ وہ ایک چیخ کے ساتھ دھڑام سے زمین پر گرا۔ مراد کے ساتھی سوجے نے گرے ہوئے پر لاٹھیاں اس طرح برسائیں کہ اس کا سر پھٹ کر کھوپڑی باہر نکل آئی۔

مجاہدین نے برکلے کی لاش وہیں جنگل میں پھینک دی اور روپوش ہو گئے۔ برکلے

کی موت انگریزی حکومت کے لئے ایسا واقعہ تھا جسے وہ کبھی نہ بھول سکی تھی۔ انگریزی فوج نے پھر راوی کے اس کنارے سے لیکر بہاولپور تک تباہی مچادی۔ جھنگ اور ساہیوال کے سینکڑوں دیہات نذر آتش کر دیئے گئے لیکن اس تباہی و بربادی کو مسلمانوں نے خوشدلی سے قبول کیا۔

مراد فتیانہ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے اس کی اراضی بھی سرکار ضبط کرلی گئی اس کی جواں اولاد کو جیلوں میں اذیت دی گئی لیکن اس کے بیٹوں نے ظلم و تشدد کے باوجود اپنے باپ کا سراغ نہ بتایا۔ مراد فتیانہ جنگلوں میں کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد دہلی چلا گیا لیکن مغل سلطنت کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ مراد فتیانہ کی تلاش میں برطانوی حکومت نے انتہائی کوشش کی لیکن وہ صوبہ سرحد کے ذریعہ افغانستان چلا گیا بعد میں اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا اس کے دو بچوں بہن بھائیوں کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ اس کی لڑکی حاملہ تھی، جیل میں اس کا بچہ پیدا ہوا اور وہ سرکاری نگرانی میں پرورش پاتا رہا۔ مراد کا لڑکا اور لڑکی جیل میں ہی موت کا شکار ہو گئے البتہ اس کا نواسہ جب جواں ہو گیا تو اسے مراد کی کچھ اراضی دے دی گئی۔

مراد کے ہاتھوں برکلے کا قتل اتنا بڑا واقعہ تھا کہ پوری حکومت چکرا گئی اور دوسری طرف مراد محض اس نیکی کی وجہ سے زندہ جاوید ہو گیا۔ برکلے کے واقعہ قتل پر لوگوں نے ڈھولے کہے وہ آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں۔ راوی اور چناب کے دوآبہ کے کسان جب پو پھٹے زمین میں ہل جوڑتے اور بیلوں کی جوڑی ہانکتے ہیں تو از خود ان کی زبان پر برکلے کے ڈھولے تھرک اٹھتے ہیں۔ انگریزی حکومت نے ان زبان زد عام ڈھولوں پر پابندی لگادی تھی۔ جس شخص کے بارے میں شبہ پڑ جاتا کہ اس نے اس قسم کے ڈھولے گائے ہیں اسے پکڑ کر جیل بھیجدیا جاتا۔ اتنی سختی کے باوجود یہ لوک گیت عوام کے دلوں میں پلتے اور پروان چڑھتے رہے۔

جوان گھبرو ترنگ میں آکر قانون کی پروا کیے بغیر ڈھوے الاپتے اور مجلسوں کا خون گرم رکھتے، میں یہاں چند ڈھوے بطور نمونہ نقل کرتا ہوں جن سے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہ ساوی آکھیا
توں کر بسم اللہ دھر پیر رکابے میں جاساں مار اڈاری
پھر سوا دیہڑ آیا نے ساوی جا لتھی وچ جھانپڑے مار بھنوالی

ترجمہ۔ مراد کی گھوڑی ساوی نے اپنے سوار سے کہا تو خدا کا نام لے کر رکاب میں پاؤں رکھ۔ میں اڑ کر سوا پہر دن جھانپڑے چکر مارتی ہوئی پہنچ جاؤنگی۔

ہ انگریز برکلی تے مراد فتیانہ وچ میدان دے گئے رل کھڈاری
انگریزدی سانگ کجھ چھلانکے تے مراد دی سانگ کجھ بھاری

ترجمہ۔ برکلے انگریز اور مراد فتیانہ دونوں میدان کے کھلاڑی تھے۔ آپس میں لڑے انگریز کا نیزہ عمدہ تھا مگر مراد کا نیزہ کاری نکلا۔

ہ مراد دلیل دا اپڑیا انگریز تے اس سانگ جگر وچ ماری
تے نہیوں کڈھ سٹیوس جویں مٹ وچوں لچھا لیندا بلاری

ترجمہ۔ دلیل کے بیٹے مراد نے انگریز پر نیزہ اس کے جگر میں ایسا مارا کہ اس کا دل اس طرح باہر اچھلا جیسے زنگریز سوت کے لچھے کو مٹ میں اچھالتا ہے

ہ شابش گھتو سوجے بھدر دں نوں جس ڈھاندے نوں ڈانگ ماری
تے کھدو کر انگریز سٹیوس پیو دادے دی پیڑھی سوں تاری .....

ترجمہ۔ شاباش دو، سوجے بھدرو کو جس نے گرتے ہوئے انگریز کو ڈانگ مار کر ہلاک کر دیا اور اس طرح اپنے باپ دادا کا نام ہمیشہ کے لیے روشن کر گیا۔

دیگریں گھوڑی گھِراں دِتیاں برکلی مرا کے جا نکلی تھاں تے کلی
بنگلے وچوں دُ کے نکل پیاں میماں اُٹھن دین پرمیری

ترجمہ :- عصر کے وقت جب برکلے کی گھوڑی اپنا سوار قتل کرا کے اکیلی اس بنگلہ پر پہنچی اور انگریز خواتین نے خون آلود گھوڑی کو سوار کے بغیر دیکھا تو معاملہ بھانپ کر بنگلے سے باہر آ کر بین کرنے لگیں مگر ان کی زبان سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اسانوں لکھیا ڈیہسی پر بنگلے گوگیرے توں لاسی کچہری
راوی تے ہن راٹھ وسن جنہاں چڑھے دیہہ لٹیا گھر سرکاری

ترجمہ :- ہمیں تو اپنا نصیب ملیگا مگر تو بھی آئندہ بنگلہ گوگیرہ میں اپنا فوجی دربار نہیں لگا سکے گا۔ راوی کا علاقہ بہادروں کا مسکن ہے جنہوں نے دن دہاڑے انگریزوں کا خانہ برباد کیا۔

یہ آخری ڈھولا کتنا اثر انگیز ہے اس میں بھرپور جذبات ملتے ہیں کہ ہمیں تو جو تقدیر سے ملے گا اس پر شاکر ہوں گے مگر تم اب کچہری لگا کر حکم نہیں سناؤ گے۔ انگریز کے خلاف زبردست نفرت کا اس سے موثر ذریعۂ اظہار کیا ہو سکتا ہے۔

مراد فتیانہ نے برکلے کو قتل کر کے تاریخ کا رخ موڑ دیا وہ انگریز جو خود کو سپر طاقت سمجھتے تھے ان کا اہم ترین پرزہ برکلے یوں قتل کر دیا گیا جیسے کسان گاجر مولی کاٹتا ہے۔ آج بھی پنجاب کی تاریخ میں مراد فتیانہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ہیرانند

۱۹۲۰ء

قصبہ چھومن علاقہ ماچھیوال کا ذیلدار ہیرانند ہترہ اپنے دور کا متمول ترین شخص تھا اس کے خاندان کا وسیع تر کاروبار خانیوال۔ وہاڑی۔ لائلپور۔ امرتسر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے خاندان کے آٹھ افراد وکالت کرتے تھے جن کا سرکاری دفاتر میں خاصا رسوخ تھا۔ ہیرانند کا اپنا وسیع تر سودی کاروبار تھا۔ علاقہ کے بیشتر مسلمان زمیندار اس کے مقروض تھے اور قرضوں کے عوض نہ صرف اپنی زرعی اراضی بلکہ زیورات۔ گھریلو سامان یہاں تک کہ عورتیں بھی رہن رکھی ہوتی تھیں۔ ہیرانند کی دولت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد یعنی ۱۹۲۱ء میں اس کا ۱۸ لاکھ روپیہ مختلف لوگوں کے ذمہ واجب تھا جس کا وہ سود وصول کیا کرتا تھا۔ مسلمان عموماً اس کے مقروض تھے اور اسی بنا پر وہ مسلمانوں کا بھی "چوہدری" بنا ہوا تھا یعنی مسلمان زمینداروں کے درمیان رشتوں ناطوں میں اس کا مکمل عمل دخل رہتا تاہم ہیرانند کا ظاہری سلوک ان لوگوں سے اچھا تھا لیکن بیش بہا روپیہ، دولت کی فراوانی۔ ماحول کی رسائی۔ حکام کی اعانت، مزاج میں تبدیلی اور خواہشات کی تکمیل کے لئے بہترین ذرائع ثابت ہوئے۔ ہیرانند ہترہ نے اپنے ان وسائل کے تحت در پردہ عیاشی اور اوباشی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس میں ہیرانند نے ہندو مسلم کی کوئی تخصیص روا نہ رکھی تھی لیکن ان معاملات پر اس کی وضعداری۔ خوش اخلاقی۔ نرم روی۔ احسان اور مروت نے پردے ڈالے ہوتے تھے لہٰذا بات زیادہ نہ پھیلی اور لوگوں نے

محاسبہ کی گنجائش نہ سمجھی۔ ان ہی دنوں بستی چھوہن کی ایک عورت صاباں جو ساجھر قوم سے تعلق رکھتی تھی اچانک گھر سے غائب ہوگئی۔ تلاش کرنے پر اس کے ورثا کو معلوم ہوا کہ اسے ہیرا نند نے اپنی نفسانی خواہش کی خاطر اپنے پاس بٹھا رکھا ہے۔ یہ واقعہ ساجھر قوم اور کھپی کے لوگوں کے لئے غیر معمولی نوعیت کا حامل تھا۔ ابتداً مغویہ کے ورثا نے چارہ جوئی کی پھر یہ معاملہ ہندو مسلم کی نوعیت اختیار کر گیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمان زمینداروں کو اپنے قرضے اور رہن یاد آئے اس طرح واقعہ کے خلاف احتجاج شروع ہوا۔ پولیس نے مقدمہ درج کیا مگر مغویہ برآمد نہ ہو سکی۔ معاملہ پھیلتا چلا گیا۔ کھپی کے ایک زمیندار میاں شبیر محمد قریشی (میاں علی محمد قریشی کے والد) کے پاس علاقہ کے مسلمانوں نے اجتماع کیا اور ہیرا نند سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچی گئیں۔ قصبہ چھوہن ان دنوں سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ ساجھر قوم کے سات افراد نے خود کو اس کام کے لئے پیش کر دیا کہ وہ اپنی موت قبول کرتے ہیں وہ ہیرا نند کو قتل کر دینے پر آمادہ ہیں۔ بات اندر ہی اندر چلتی رہی۔ ان ہی دنوں بنوں کے چند پٹھان جو سودی کاروبار کرتے تھے اس علاقہ میں آئے انہوں نے ہیرا نند کی دولت کی خبریں سنیں۔ مسلمانوں کے جذبات دیکھے۔ ان پٹھانوں نے مغویہ کے ورثا سے رابطہ پیدا کیا اور ہیرا نند کے قتل کا منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ اس منصوبہ کے مطابق سات افراد ساجھر قوم کے اور چار پٹھان خوئیداد خاں۔ گل خان۔ نادر خان۔ شہباز خان نے رائفلوں۔ تلواروں اور نیزوں سے مسلح ہو کر ہیرا نند کے مکان پر حملہ کر دیا۔ اس وقت مغویہ بھی اسی مکان میں تھی۔ ملزمان نے مغویہ کو قابو کیا اور ہیرا نند پر فائرنگ کی جس کے نتیجہ میں وہ موقع پر ہی ڈھیر ہوگیا۔ ان ملزمان نے مکان کی مکمل تلاشی لی۔ ہزاروں روپے کے زیورات اور نقدی اٹھا لی۔ ہیرا نند نے جن جن کھاتوں پر مسلمان مقروضان کے کوائف وغیرہ اور قرضوں کی رقومات تحریر کی ہوئی تھیں ایسے تمام کاغذات ایک جگہ جمع کر کے ان کو آگ لگا دی تاکہ غریب مسلمان جو مقروض ہو کر سسک رہے تھے ان سے نجات پا جائیں اور ہیرا نند کے ورثا بھی عدم ثبوت

کی بنا پران کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکیں۔

ہیرانند قتل ہوگیا۔ مغویہ برآمد کرلی گئی اس کی دولت لٹ گئی اور مکان جلا دیا گیا۔

ہیرانند کا قتل اہم واقعہ تھا۔ علاقہ کی مسلم آبادی اس سے نجات پاچکی تھی اور غیر مسلم آبادی خوف و ہراس کے باعث نقل مکانی پر مجبور ہوگئی تھی۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے ساجھر قوم کے سات افراد کو گرفتار کر لیا۔ ان کے ساتھ عمرا اور میاں شیر محمد قریشی بھی گرفتار ہوگئے۔ بنوں کے پٹھان روپوش تھے ان کی تلاش میں پنجاب صوبہ سرحد کی پولیس اور قبائلی علاقوں کے پولیٹکل ایجنٹ گاؤں گاؤں چھاپے مارتے رہے ان میں خو عیداد خان جو قصبہ مونجی بنوں کا تھا افغانستان کی سرحد عبور کرتے ہوئے گرفتار ہوگیا اس کی گرفتاری کے بعد باقی تین ملزم بھی پولیس نے گرفتار کر لئے۔ اب مقدمہ عدالت میں تھا۔ بظاہر قتل و ڈکیتی کا مقدمہ تھا لیکن دراصل ہندو مسلم سوال بن چکا تھا۔ مسلمان وکلاء صفائی نے جو موقف اختیار کیا اس سے مقامی ملزمان کی بریت یقینی تھی کیونکہ کہانی کا آغاز ایک عورت کے اغوا سے ہوا تھا۔ عورت مسلمان تھی اور اغوا کنندہ ہندو، اسے اشتعال اور غیرت سے تعبیر کیا جا سکتا تھا اور اس مقدمہ میں ایسا ہی ہوا۔ لیکن پٹھان ملزمان مسلمانوں کے اس موقف سے بری نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ نہ تو یہ یہاں کے تھے اور نہ ہی مغویہ سے ان کا کوئی تعلق تھا اور نہ ہیرانند مقتول سے ان کی کوئی دشمنی ثابت ہوسکتی تھی۔ مقدمہ کی نوعیت عجیب ہوچکی تھی۔ پٹھانوں کے علاوہ دیگر ملزمان ہیرانند کو انتقام کا نشانہ بنانے کے باوجود بری کئے جانے کے مستحق ہوچکے تھے۔ ہیرانند کے ورثا اس اعتبار سے مطمئن تھے کہ اصل ملزمان کو سزائیں یقینی تھیں۔ چنانچہ اس مقدمہ نے ایک قسم کے میلہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جھنگ صدر میں جس روز مقدمہ کی پیشی ہوتی ضلع بھر کے مسلمان رؤسا میاں حسین شاہ آف رجوعہ، محمد حسین شاہ آف کوٹ عیسےٰ شاہ۔ میاں چوہڑ شاہ۔ نور محمد چیلہ۔ میجر مبارک علی شاہ۔ نواب ذوالفقار علی آف گڑھ مہاراجہ۔ شیخ یوسف شاہ بارایٹ لاء وغیرہ پہنچ جاتے ضلع کچہری میں ایک

ہجوم ہوتا۔ دوسری طرف پٹھان ملزمان کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ اول تو ان کے ورثا پیشی پر نہیں آتے تھے البتہ خوئیداد خاں کی والدہ ہر پیشی پر آجاتی تھی اور اس کی رہائش چوہدری غلام سرور مرحوم رئیس محلہ پنڈی جھنگ صدر کے ہاں ہوتی کیونکہ چوہدری صاحب مرحوم کے نانا شیخ خدابخش طویل عرصہ بنوں کے قصبہ شیخ والا میں مقیم رہے تھے ان کی وجہ سے خوئیداد خاں ملزم کی والدہ چوہدری صاحب کے ہاں آتی جاتی تھی۔

ماتحت عدالت سے مقدمہ مکمل ہو کر سیشن جج کی عدالت میں پہنچ گیا۔ ان دنوں ملتان کا سیشن جج جھنگ آکر ایسے مقدمات کی سماعت کیا کرتا تھا۔

۱۱ر نومبر ۱۹۲۲ء فیصلہ کی تاریخ مقرر تھی۔ احاطہ کچہری کے چاروں طرف مسلح پولیس کا پہرہ تھا۔ ہندو اور مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے۔ ملزمان جب عدالت میں پیش ہوئے تو نعرہ بازی شروع ہو گئی۔ عدالت نے مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے تو ملزمان کو بری کر دیا اور چار پٹھان ملزمان کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ پٹھان ملزمان نے اس حکم کے خلاف اپیل کر دی جو مسترد ہو گئی ان چاروں کو جھنگ جیل میں ایک ہی دن پھانسی پر لٹکا دیا گیا ان کی لاشیں شہر کے مسلمانوں نے وصول کیں اور غسل و کفن کے بعد اسلامیہ ہائی سکول کے احاطہ میں لائی گئیں تاکہ جنازہ پڑھا جائے مگر ہندوؤں نے مقامی افسروں کو یہ تاثر دیا کہ اس طرح شہر میں فرقہ وارانہ نفرت بڑھنے کا احتمال ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو نماز جنازہ سے روکا جائے اور لاشیں سرکاری نگرانی میں ضلع کی حدود سے باہر نکالی جائیں ڈپٹی کمشنر نے ہندوؤں کے ان تاثرات سے اتفاق کیا اور دفعہ ۱۴۴ کے تحت نماز جنازہ پڑھنے کو ممنوع کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر کے اس فیصلہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مسلمان مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ پولیس اسلامیہ سکول میں داخل ہو کر لاشوں پر قبضہ کر چکی تھی اور بلا نماز جنازہ اٹھا کر لے جانا چاہتی تھی۔ دوسری طرف مسلمان لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح باہر سڑک پر جمع ہو گئے ۔۔۔ کہ نماز جنازہ کے بغیر لاشیں نہیں اٹھانے دیں گے۔ کشیدگی بڑھ گئی "

ہندوؤں نے دکانیں بند کر دیں۔ مسلمان گلی کوچوں میں پُرجوش نعرے لگاتے ہوئے اسلامیہ سکول کی طرف بڑھنے لگے۔ ہزاروں کا ہجوم جمع ہوگیا۔ پولیس کپتان اور ڈپٹی کمشنر موقع پر پہنچے۔ مسلمانوں کی طرف سے میجر مبارک علی شاہ، شیخ غلام یٰسین ایڈووکیٹ مرحوم بانی اسلامیہ ہائی سکول اور چوہدری غلام سرور پیش پیش تھے۔

پولیس حکام نے مسلمانوں کو منتشر کرنے کے لئے متعدد بار حکم دیا مگر مسلمانوں کا جوش وخروش اور زیادہ بڑھتا گیا۔ لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو چکا تھا۔ میجر مبارک علی شاہ ان دنوں پرجوش نوجوان تھے وہ ہجوم چیر کر حکام کے پاس پہنچے اور ڈپٹی کمشنر سے کہا" اگر لاء اینڈ آرڈر کی عزت چاہتے ہو تو لاشیں مسلمانوں کے حوالے کر دو۔ ورنہ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی مسلمانوں کے غیض وغضب کو حکومت کی بندوقیں نہیں روک سکیں گی۔

چنانچہ صبح ۹ بجے کی بات شام ۴ بجے طے ہوئی حکومت اور غیر مسلم شکست کھا گئے لاشیں مسلمانوں کے سپرد کر دی گئیں۔ ۵ بجے شام ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ لاشیں سکول کے موجودہ ہال کے پاس رکھی تھیں اور مسلمانوں کی صفیں گرجا تک پھیلی ہوئی تھیں۔

جنازہ کے بعد سرکاری لاری میں لاشیں رکھ کر سرگودھا پہنچا دی گئیں جہاں سے ان کے ورثا بنوں لے گئے۔

ہیرانند کے قتل کے بعد مسلمان مالی مجبوریوں سے نجات پا گئے یہ واقعہ اہل جھنگ کے لئے ایک یادگار بن گیا جس کے سینکڑوں عینی شاہد بقید حیات ہیں۔

نواب محمد نواز ڈب

۱۹۴۱ء

انسان کیا سوچتا ہے؟ اس کی سوچ کے دھاگے فضا کی لہروں پر خواہ کتنے ہی سرگم پیدا کریں ان سے سوز و نغمہ کی کتنی کرنیں ناچیں مگر تقدیر کے آہنی ہاتھ ایسے ساز و آواز کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ موت کے غیر مرئی پنجے انسان کے عزم وارادہ۔ سوچ اور فکر کے سہانے خوابوں کو چند لمحوں میں ختم کر کے رکھ دیتے ہیں اور انسان جس کا ضمیر آگ اور پانی کی آمیزش سے تیار ہوا ہے اپنے ہی جسم کی بھٹی میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے اس کا کروفر، اس کی دولت و سطوت، اس کی عظمت و قوت بے جان لاشہ ہو کر اس قدر مجبور ہو جاتی ہے کہ موت کی ایک ہچکی کے بعد اپنے جسم کا بوجھ بھی اٹھانے کے قابل نہیں رہتی اور غیروں کے شانوں پر بے حس و حرکت قبرستان یا شمشان تک کا سفر کرتا ہے یہ المیہ نہیں تو کیا ہے؟ یہ احساس کی موت نہیں تو اور کیا شے ہے؟ اس سے زیادہ دولت و سطوت۔ جاہ و حشم کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس سے زیادہ تحقیر آدمیت کا نمونہ اور کہاں مل سکتا ہے؟ کاش انسان کی سوچ کے زاویے راہ نہ بھولتے۔

نواب محمد نواز ڈب ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک المیہ کا عنوان ہے اس المیہ کی تہ میں نواب محمد نواز ڈب کی لامحدود خواہشوں کا چیختا۔ سسکتا قبرستان موجود ہے جہاں اس کے خاکی جسم کی ہڈیاں۔ گوشت اور ریشے زمینی کیڑوں کی مرغوب غذا بن چکے ہیں۔ اس کے جسم کی وہ آگ جسے وہ شراب سے بجھانا چاہتا تھا۔ ساری عمر

کوشاں رہا مگر وہ نہ بجھ سکی۔ وہ زمین کی ٹھنڈی تہ میں جذب ہو کر ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ سیم وزر سے کھیلنے والا مستقبل کے تقاضوں اور شرافت کی ضرورتوں سے بے نیاز محمد نواز پسماندگان کے چند آنسوؤں۔ آہوں۔ چیخوں اور گریہ و فغاں کی سرسراہٹوں کو بھی آنکھ بھر کر دیکھنے کا متحمل نہ ہو سکا۔ کیا سطوت و شوکت کا یہی مآل ہے؟

جی ہاں یہی انجام ہے۔

آپ شاید نہ جانتے ہوں محمد نواز ڈب اس دنیا کا خوش قسمت انسان تھا۔ فطرت نے اسے مردانہ حسن کی دولت عطا کی تھی۔ سیم وزر اس کے سامنے حلقہ باندھے رہتے، وہ پلک جھپکنے کی مہلت میں اس دنیا کی ہر ملکہ صبا کو تخت سمیت اپنے خلوت کدہ کی زینت بنانے پر قادر تھا جو پانی کی جگہ شراب اور کھانے کی جگہ پھلوں کا غیر ملکی سربلند ملغوبہ استعمال کرتا تھا۔ اس کے گاؤں ڈب کلاں میں اس وقت بجلی کی سہولتیں اس کے راحت کدہ کو میسر تھیں جبکہ بڑے بڑے شہر اور قصبے اس سے محروم تھے۔ اس کے شبستان راحت میں شیشے کے تالاب تھے جس میں مرمریں جسم۔ دراز اور گھنی زلفیں، چھوٹی بڑی مچھلیوں اور ناگوں کی طرح مچلتی تھیں۔ ان نفیس و منقش تالابوں میں حسن کی وہ مورتیاں جن کے رنگ و روغن اور نقش و نگار پر خود خالق بھی محو استعجاب رہتا۔ لباس کی ظاہری پابندیوں سے آزاد اور جنس مخالف کی خواہشوں کے مطابق غوطے لگاتیں اور انگور کی لائی سے دل بہلایا کرتی تھیں ایسے کئی راحت کدے آباد تھے ان حسین مندروں میں بیسیوں حسن کی دیویاں آرتی پوجا میں محو رہتی تھیں۔

نواب ڈب نے قصبہ ڈب کلاں کے علاوہ جھنگ صدر میں ایک پراسرار محل ڈب ہاؤس کے نام سے اپنی نفسانی خواہشات کے تقاضوں کے مطابق تعمیر کرایا تھا اس محل کے اسرار و رموز کی تہہ تک پولیس کے تفتیشی افسروں کا دماغ بھی رسائی نہ پا سکا۔ اس محل کے مختلف کمرے راحت کدہ تھے۔ موسم کے مطابق اس میں سامان سجا

ہوا تھا۔ شدید سردی میں بھی یہ راحت کدے گرم رہتے تھے اور شدید گرمی میں ٹھنڈے، دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہ تھی جس سے یہ راحت کدے محروم ہوں۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں سے قیمتی درخت ڈرموں اور دیگنوں کے حساب سے نہ منگوائی جاتی ہو۔ عریاں اور فحش تصویروں کے سینکڑوں البم ڈرائنگ روم کی زینت تھے اور فلمی ایکٹرسوں کے اشتہا انگیز فوٹو خصوصی آرڈر پر اس کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔ نواب محمد نواز ڈب دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی تھا لیکن اپنی لاابالیوں عیاشیوں اور خرمستیوں کے باعث وقت کا ایک المیہ بن گیا ایسا المیہ جس کے عنوان سے حرف آخر تک حسرتوں کے لاتعداد مزار ہیں۔ ایسا المیہ جس سے انسان کا احساس زخمی ہو جائے، جس سے انسان کی انسانیت شرم و حیا کے باعث منہ چھپاتی نظر آئے۔ جس سے سرشت آدمیت پسینہ پسینہ ہو جائے اور اخلاقی قدروں کا مرگھٹ بنے ایسا مرگھٹ جس کا دھواں آج بھی فضائے بسیط پر مچل رہا ہے اور جس کی بو عظمت آدم کی تلاش میں ابھی تک بھٹک رہی ہے۔

نواب محمد نواز ڈب داستان گوئی کی تاریخ کا ایک اہم کردار تھا۔ انگریز مصنفین نے اس کے حالات و سوانح پر خصوصی مضامین لکھے۔ لندن۔ پیرس۔ قاہرہ۔ نیویارک تک اس کی شہرت ہوئی۔ اس کے مقدمہ کی کارروائی دنیا کے چند اہم ترین مقدمات کا جزو بن گئی۔ "ورلڈ فیمس ٹرائل" نامی کتاب جس میں دنیا کے صرف دس اہم مقدمات کی روداد شائع ہوئی ہے اس میں محمد نواز کی کہانی بھی نمایاں ملتی ہے۔

ڈب کلاں نام کا ایک قصبہ ضلع جھنگ کی تحصیل شورکوٹ کے مغرب میں ساحل چناب کے قریب آج بھی موجود ہے۔ یہ قصبہ کچی پکی جھونپڑیوں۔ کچی اینٹوں کے پستہ قد مکانوں سرکنڈوں سے تیار ہونے والی کلیوں اور ہری بھری کھیتیوں سے آج بھی آراستہ ہے اور اسی قصبہ میں نواب محمد نواز ڈب کلاں کا محل اور اس کے راحت کدوں

کے آثار آج بھی تصویر عبرت ہیں۔

محمد نواز شاید یہ سمجھتا تھا کہ دولت و سرمایہ ہر دکھ کا علاج اور ہر غم کا مداوا ہے لیکن اس نے خود مشاہدہ کیا اور اس مشاہدہ کی تلخیوں کو شراب ناب کے ذریعہ مٹھاس میں بدلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

ایچیسن کالج لاہور

یہ کالج بظاہر برطانوی حکومت نے اجڈ اور قبائلی سرداروں کی اولاد کو جدید طریقہ تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لئے قائم کیا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ پنجاب کے سرکردہ اور صاحب حیثیت لوگوں کے ذہنوں میں برطانویت کے جراثیم پیدا کرنے اور اپنا فکری تہذیبی اور سیاسی غلام بنانے کے لئے ایچیسن کالج لاہور کا نمایاں حصہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کالج یا اس قسم کے دیگر کالجوں سے پڑھنے والے مسلمانوں میں سے کوئی ایک بھی جدوجہد آزادی میں عملاً شریک نظر نہیں آتا کیونکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا نواب، خان بہادر اور سر، قسم کی مخلوق تھے۔

نواب محمد نواز ڈب رئیس ابن رئیس تھا اسے ایچیسن کالج میں بھی وہی شاہانہ ماحول میسر آیا جو اس کے اپنے گاؤں ڈب کلاں میں تھا۔ نواب ڈب نے کالج کے ماحول سے انگریزی معاشرت۔ آداب اور تمدن کے اثرات قبول کیئے مگر تعلیمی قابلیت کے مجوزہ معیار تک نہ پہنچ سکا۔ اس کالج سے دوسرا بڑا فائدہ اسے یہ پہنچا کہ پنجاب کے دیگر امیر کبیر خاندانوں اور نواب خاندانوں سے اس کی راہ و رسم ہو گئی اور ان کے گھروں کے کھلے ماحول میں اپنے مردانہ حسن اور لاکھوں روپے کی آمدنی کی وجہ سے بےحد مقبول ہو گیا یہاں تک کہ بڑے گھرانے اسے اپنی بیٹیاں پیش کرنے لگے۔ انہی گھرانوں میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور انگریز کے مشہور وفادار سر فضل حسین کا گھرانہ بھی تھا۔

سر فضل حسین ۱۹۲۷ء میں پنجاب کے وزیر تعلیم تھے اس زمانہ میں وزرا کتنے اثر و

رسوخ کے مالک ہوتے تھے اس کا اندازہ سیاسی ذہن رکھنے والا ہر شخص کر سکتا ہے۔ چنانچہ نواب محمد نواز ڈب کی شادی سر فضل حسین کی منجھلی لڑکی سے ہو گئی، یہ شادی اہل لاہور کے لئے یادگار تصوّر ہوتی ہے کم و بیش دس لاکھ روپیہ اس شادی پر صرف ہوا۔ ہندوستانی صوبوں کے بیشتر گورنر۔ صوبائی وزرا۔ وائسرائے کونسل کے اراکین اعلیٰ سول و فوجی حکام۔ مشہور سیاستدان سبھی اس تقریب میں مدعو تھے۔

سر فضل حسین کی کوشش رہی کہ اس کا داماد سیاسی زندگی اختیار کرے اور پنجاب کے حکومتی افق پر طلوع ہو لیکن محمد نواز فکری اعتبار سے اتنا بلند نہ ہو سکا۔ چنانچہ خسر اور داماد کے درمیان صرف دو سال کے عرصہ میں اتنی ناچاقی پیدا ہو گئی کہ ایک دوسرے کو دیکھنے تک کے روادار نہ رہے۔ محمد نواز کو گھریلو اخراجات کے علاوہ بیس ہزار روپیہ ماہانہ خرچ ملتا تھا لیکن یہ خطیر رقم دس بارہ دنوں میں صرف ہو جاتی "شراب و شباب" کی محفلوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ جھنگ ہو یا لاہو۔ ڈبکلاں ہو یا ملتان اس کا قافلہ کاروں پر سفر کرتا۔ کاروں میں رقاصائیں۔ سازندے شراب کی پیٹیاں۔ عیش و راحت کے لوازمات ہوتے۔ جہاں جاتا جنگل میں منگل کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اس کی شہ خرچی کا بڑا چرچا تھا۔

ایک دفعہ جھنگ صدر کے ڈب ہاؤس میں چند دنوں کے لئے ٹھہرا ہوا تھا کہ شہر کے کچھ مسلمان ایک جامع مسجد کی تعمیر کے لئے چندہ لینے اس کے پاس گئے ان کی بات سن کر مسکرایا اور زوردار قہقہے لگائے اور کہنے لگا تم لوگ بھی کتنے بھولے ہو میری کمائی مسجد پر صرف ہو سکتی ہے؟ اگر تم اس کے باوجود بضد ہو تو شراب کی دو پیٹیاں لے جاؤ اور مسجد کے گارے میں پانی سمجھ کر ڈال دینا۔ چندہ لینے والے لوگ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

بلاشبہ محمد نواز کے جسم نے ہزاروں گیلن شراب اپنے اندر جذب کی ہو گی۔ تین

ڈاکٹر محض اس کی مردانہ صحت قائم رکھنے اور اسے تنومند بنانے پر مامور تھے اور کثیر معاوضے لیا کرتے تھے۔ بعض یونانی اطبا پانچ پانچ ہزار روپے کے عوض شہوت انگیز اور ممسک طلاً یا کشتے فروخت کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کثیر اخراجات ماہانہ جیب خرچ سے پورے نہیں ہو سکتے تھے لہذا اس نے شراب و شباب کی اندر سبھا قائم رکھنے کے لئے وسیع تر جائیداد فروخت کرنی شروع کر دی۔ ملتان کی زرعی اراضی اس نے لاکھوں روپے میں فروخت کر دی اور شاہزادگی کے ٹھاٹھ باٹھ بنائے رکھے،

۱۹۳۰ء میں اس کی لڑکی پیدا ہوئی یعنی سر فضل حسین کی نواسی۔ لڑکی کی پیدائش کے بعد لوگوں نے خیال کیا کہ اب وہ آوارہ زندگی سے دستکش ہو جائیگا مگر ان کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا بلکہ میاں بیوی میں ایسی ناچاقی ہوئی کہ ۱۹۳۶ء میں اس نے سر فضل حسین کی بیٹی کو اہانت آمیز طریقہ سے طلاق دے دی۔

سر فضل حسین کی لڑکی کو طلاق دینے کے واقعہ سے قبل اس کے پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے اور مذکورہ پس منظر کے لئے جھنگ کے پڑھے لکھے لوگوں کی روایتیں زبان زد عام ہیں۔

مشہور ہے کہ محمد نواز ڈب کی شادی سر فضل حسین کی لڑکی سے ہوئی تو اس لڑکی نے والدین کی مرضی و منشا کے خلاف شادی کے لئے ایک شرط رکھی تھی کہ وہ جھنگ کے بجائے لاہور میں اپنی مستقل رہائش اختیار کرے گا۔ محمد نواز نے بلا سوچے سمجھے یہ شرط مان لی اور سر فضل حسین کی کوٹھی سے ملحق اراضی خرید کر نئی کوٹھی تعمیر کی اور اسے اپنی ہونے والی بیوی کے نام منتقل کر دیا۔ چنانچہ شادی کے بعد صرف ایک دن اور دو راتیں دلہن اس کے مکان قصبہ ڈب کلاں میں رہی اس کے بعد اس نے لاہور کی نئی کوٹھی میں رہائش رکھ لی۔ محمد نواز سال میں دو چار مرتبہ لاہو جاتا بیوی کے ہاں قیام کرتا مگر بیوی کے سلوک سے وہ مطمئن نہ تھا اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی بیوی

ولی عہد ریاست نابھہ میں گہری دلچسپی رکھتی تھی جو اس کی ملحقہ کوٹھی میں مقیم تھا۔ میاں بیوی کے درمیان شکوک بڑھتے چلے گئے اور اس نوع کی کہانیاں پر لگا کر پھیلتی اور بڑھتی رہیں۔ محمد نواز کا معمول تھا کہ وہ اپنی اراضی مواضعات کی صورت میں یکمشت فروخت کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ اس سے کسی دوست نے سوال کیا کہ تم اپنی جائیداد کیوں خراب کر رہے ہو تو اس نے جواب دیا کہ میرے مرنے کے بعد وسیع جائیداد میرے مخالفین کو ملے گی میں نہیں برداشت کرتا کہ جو لوگ میری زندگی میں مخالف ہیں وہ میری جائیداد پر گلچھرے اڑائیں میری انتہائی کوشش ہے کہ ساری جائیداد فروخت کر دوں یہاں تک کہ ڈب ہاؤس کا بھی سوداگر کے کار سمیت دریا میں ڈوب جاؤں تاکہ میری کوئی جائیداد باقی نہ رہے اسی خیال کے تحت اس نے اپنی بیوی کو منہ دکھائی کا جو قیمتی ہار پیش کیا تھا اس کی مالیت پچاس ہزار روپیہ تھی اس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے اس نے اپنی بیوی سے چھین لیا تھا اور لاہور کی کوٹھی کا خرچہ بھی بند کر دیا تھا جبکہ اس کی اکلوتی بیٹی کی عمر اس وقت آٹھ سال کے قریب تھی اور وہ محمد نواز کی موت تک سر فضل حسین کے ہاں پرورش پاتی رہی۔

اس کی شاہ خرچی کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک دفعہ کسی اعلیٰ نسل کا کتا لندن کے کسی لارڈ سے ۳۰ ہزار روپے کے عوض خریدا۔ یہ کتا ہوائی جہاز کے ذریعہ ایک انگریز جھنگ لے آیا۔ سردی کا موسم تھا اس نے کتا ڈب ہاؤس کے لان میں چھوڑ دیا جہاں وہ اچھلتا کودتا رہا۔ دس بجے محمد نواز جب سو کر اٹھا اور باہر نکلا۔ ملازموں نے اسے کتے کے بارے میں بتایا تو وہ لان کی طرف چلا گیا۔ انگریز سے علیک سلیک کی اور کتے کا نام پوچھا اس نے کتے کو اسی نام سے دو تین مرتبہ پکارا مگر کتے نے محمد نواز کا اشارہ نہ سمجھا اور توجہ نہ کی۔ محمد نواز نے اسی وقت پستول نکال کر کتے کو ختم کر دیا اور انگریز کو تیس ہزار نقد کرایہ آمد و رفت دے کر روانہ کیا۔

جھنگ میں ایک ہندو ڈاکٹر دیوراج مشہور تھا اور یہ ڈاکٹر ان کا فیملی معالج بھی تھا ڈاکٹر نے اپنے لڑکے گھوش کی شادی پر محمد نواز ڈب کو بلایا۔ گھوش اور اس کی بیوی نے سلامی لینے کے لئے اسے سلام کیا۔ اس نے ایک ایک ہزار روپیہ دونوں کو سلامی کا دیا۔

ڈاکٹر دیوراج نے وہ روپیہ ان سے لے کر محمد نواز کو واپس کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں روپے کی ضرورت نہیں بلکہ اس جوڑے کے لئے ایک اچھی رہائش گاہ کی ضرورت ہے اگر تم ان چڑیوں کو گھونسلہ مہیا کر سکو تو بہتر ہے۔

محمد نواز نے اسی وقت اپنی کوٹھی جو گوجرہ روڈ پہ ہے ان کے نام منتقل کر دی۔ پاکستان بننے کے بعد اس کوٹھی میں اردو کے مشہور ادیب غلام بھیک نیرنگ آباد ہوئے آج کل اس میں شکر گنج ملز کا دفتر قائم ہے۔

محمد نواز نے ہمیشہ سچی یا جھوٹی آن کا خیال رکھا اور وہ خود کو ہر قسم کے قاعدہ قانون سے ماوراسمجھتا تھا اس کی زبان ہی قانون تھی۔

ایک دفعہ ٹوپی والا فقیر اس کے ڈب ہاؤس گیا۔ ٹوپی والا فقیر جھنگ کی اہم شخصیت تھی اس نے محمد نواز سے ایک روپیہ مانگا اس نے اپنے ملازموں سے کہا کہ اسے ایک بوتل شراب دے دو۔ فقیر نے انکار کیا تو اس نے فقیر کو ڈانٹ کر کہا تم بیوقوف ہو ایک روپیہ تم نے مانگا میں نے پچپن روپے مالیت کی بوتل تمہیں دے دی کیوں نہیں لیتے فقیر نے جواب دیا شراب حرام ہے میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا۔ محمد نواز نے اسی وقت ملازموں کو حکم دیا کہ فقیر کے منہ میں شراب ڈالی جائے چنانچہ نوجوان نوکروں نے فوراً تعمیل کی۔ فقیر کو زمین پر لٹا کر اس کے منہ میں شراب ڈالدی۔ کچھ حلق میں چلی گئی کچھ داڑھی پر گری اور پھر اسے دھکے مار کر باہر نکال دیا۔

اس واقعہ پر مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا۔ مساجد میں اس واقعہ کی مذمت کی گئی مسلمان وکلا نے فقیر کی طرف سے اسلام کی توہین کرنے پر محمد نواز کے خلاف عدالت میں استغاثہ

دائر کر دیا جو تین سال چلتا رہا۔ ۱۹۵۰ء میں عدم پیروی کی بنا پر خارج ہو گیا۔

ان واقعات سے محمد نواز کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔

پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد ملتان کی ایک دوشیزہ پر نظر رکھی لیکن شدید خواہش اور کوشش کے باوجود اسے خواب گاہ کی زینت اس وقت تک نہ بنا سکا جبکہ اس کے والدین باقاعدہ رشتہ دینے اور نکاح کرنے پر آمادہ نہ ہوئے چنانچہ اس دوشیزہ سے محمد نواز نے شادی کی اور اس نے محسوس کیا کہ پہلی بیوی کی نسبت سے یہ دوشیزہ اس کے لئے مناسب ہے۔ میاں بیوی دونوں مطمئن تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا مذکورہ بیوی ایک سال چھ ماہ بعد فوت ہو گئی۔ اگر وہ نہ مرتی تو امکان تھا کہ محمد نواز کی بے راہ روی کو روک لیتی۔ بیوی کی موت کا اسے شدید صدمہ ہوا۔ اپنے اس غم کو شراب کے ذریعے غلط کرنے کے لئے اس نے بادہ نوشی کی رفتار تیز کر دی اور بدمست رہنے لگا۔ اس کا جگر خراب ہو گیا لیکن اس نے اپنی جسمانی صحت کا کوئی خیال نہ کیا جب پوری طرح اس کا جسم نڈھال ہو گیا تو میو ہسپتال میں داخلہ لیا جہاں اس نے ڈاکٹروں کے سامنے پہلی شرط یہ پیش کی کہ وہ شراب نہیں چھوڑ سکتا چنانچہ ڈاکٹروں نے بھی شراب کلی طور پر بند نہ کی بلکہ کم کر دی اور علاج کے دوران نہایت قیمتی شراب اسے مہیا کی جاتی رہی۔

ہسپتال میں بھی اس کی "دید بازی اور دست درازی" کی کہانیاں اس قدر مشہور ہوئیں کہ صوبہ کے انگریز گورنر کو مداخلت کرنی پڑی۔

محمد نواز کی صحت قدرے بحال ہوئی تو صوبہ کے انگریز گورنر نے سر سکندر حیات کے مشورہ سے اسے فوج میں رنگروٹ بھرتی کرنے والے ایک شعبہ کا اعزازی انچارج بنا دیا تاکہ مصروف ہو کر غیر ضروری دلچسپیوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس مقصد کے لئے اسے جو دفتری عملہ دیا گیا وہ بیشتر خواتین پر مشتمل تھا اور ان میں کوئی بھی خاتون چالیس برس سے زیادہ عمر کی نہ تھی۔ کرنل سید عابد حسین۔ میجر مبارک علیشاہ۔ سید محمد حسین شاہ رئیس کوٹ عیسٰے شاہ بھی

فوجی ریکروٹمنٹ پر مامور تھے۔ مگر محمد نواز چھ ماہ کے بعد ہی ان پابندیوں سے آزاد ہو گیا اور فوجی بھرتی کے محکمہ سے علیحدہ ہو گیا۔ محمد نواز کا یہ اقدام بغاوت ہند کے جرم کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ ۱۹۳۹ء ستمبر میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ برطانوی حکومت کو پنجاب کے علاوہ اور کسی صوبہ سے فوجی بھرتی یا چندہ ملنے کی امید نہ تھی۔ برطانوی حکومت نے بڑی حکمت عملی سے پنجاب کے زمینداروں۔ رئیسوں۔ نوابوں کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا یہ لوگ اپنے اثر و رسوخ سے دیہاتوں کے جیالے جوان پکڑ کر انگریز کے حوالہ کرتے اور اس کے عوض جاگیریں انعام میں پاتے اور خطابات و عطایات سے نوازے جاتے تھے۔

محمد نواز کے خلاف برطانوی حکومت کا غصہ بجا تھا لیکن اسے محض اس لئے معاف کر دیا گیا کہ مبادا اس کے خلاف کاروائی کرنے سے پنجاب کے دیگر زمیندار ناراض ہو جائیں

محمد نواز لاہور کی محفلیں اجاڑ کر جھنگ چلا آیا اور ڈب ہاؤس میں چنچل دوشیزگان کی سبھا جما کر حال مست ہو گیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اس کی صحت جواب دیتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں کے اصرار پر محمد نواز اپنا میڈیکل کرانے کے واسطے ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں پھر لاہور گیا اور اس وقت کے مشہور ہوٹل فلیٹی میں قیام کیا۔ دن کو ڈاکٹروں سے اپنی صحت کے لئے مشورہ کرتا اور رات کو ہوٹل کے کمروں میں داد عیش دیتا۔ فلیٹی میں چند روزہ قیام کے دوران اس کا اوسط خرچ تیس پینتیس ہزار روپے ہو جاتا تھا۔

انہی دنوں لاہور میں روپ کے شوری سٹوڈیو سے تیار ہونے والی فلم منگتی پنجابی کی زور شور سے نمائش ہو رہی تھی۔ منگتی کے سوز بھرے گیتوں سے پنجاب کی فضا گونج اٹھی اور شمشاد بائی کے رقص نے تماش بینوں کے دل موہ لئے۔ محمد نواز نے خاص اہتمام سے منگتی فلم دیکھی اور ایسا متاثر ہوا کہ مسلسل بارہ دن تک شمشاد بائی کا رقص دیکھتا رہا اس کے دل میں بار بار ٹیس اٹھتی کہ کاش شمشاد اس کے پہلو میں ہوتی، اس کا دل گرماتی۔

اپنے رقص کے زاویوں سے اس کے ادراک کی نذر میں نکھارتی۔

محمد نواز نے فلیٹی ہوٹل کے انگریز منیجر سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور منیجر کو ایسے انداز سے کہا کہ اس کا دل پسیج گیا اسے اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس نے وعدہ کرلیا کہ دو چار روز تک شمشاد بائی تمہارے کمرے میں ہوگی لیکن شمشاد محض رقاصہ ہے کسبی نہیں اس سے اگر دست درازی کی تو معاملہ سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

محمد نواز نے ہوٹل کے منیجر سے وعدہ کرلیا کہ وہ ہرگز غیر مہذب گفتگو نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی ایسی حرکت ہوگی جس سے تمہیں شرمندگی اٹھانی پڑی اور ایک ہزار روپیہ منیجر کے سامنے رکھ دیا کہ یہ پیشگی صرف تمہارے لئے ہے شمشاد کو میں خود راضی کروں گا۔ چنانچہ وعدہ کے مطابق ۶ر نومبر ۱۹۴۱ء کی نیم سرد شام کو جبکہ لاہور کی فضا پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندیں شروع تھیں ۸ بجے کے قریب شمشاد بائی اپنے بھائی طالب حسین اور سازندوں کے ہمراہ کار پر ہوٹل پہنچی۔ محمد نواز نے شمشاد کے گداز جسم۔ گول چہرہ، بھرتیلے ہاتھوں اور بازوؤں کا سرسری طور پر نظری جائزہ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ غالباً اس دنیا میں آیا ہی اس لئے تھا کہ شمشاد بائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے حسن سے دل برمائے۔

شمشاد بائی نے فلیٹی کے مخصوص کمرہ میں رقص شروع کیا اور رات بھر جاری رہا۔ شمشاد بھی جانتی تھی کہ بگڑے رئیسوں کو کس ادا اور کس شوخی سے مٹھی میں بند کیا جاتا ہے وہ خاندانی طوائف تھی اس کی ماں اور دادی نے لاہور کے شاہی محلہ میں برسوں اپنا جسم اور اپنا فن بیچا تھا۔ شمشاد کی منہ بولی خالہ کھنڈو طوائف جھنگ میں رہائش پذیر تھی اور کئی نوابوں، رئیسوں کے دل گرما چکی تھی۔

۶ر نومبر ۱۹۴۱ء کی یہ رات محمد نواز کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھی کیوں کہ اس رات کی پہلی ملاقات شمشاد کی موت کا سامان تھی۔ رات بھر رقص و نغمہ کی محفل جاری رہی۔ محمد نواز نے اپنی دولت کے زور سے شمشاد کو جسم سے جسم ملانے پر آمادہ کرلیا، یا شمشاد گریز

کی منزلوں کو جان بوجھ کر ترک کرتے ہوئے روپے کے لالچ میں اس کی گود میں چھم سے آگری اور پھر وہ ایسی جذب ہوئی جس طرح غنچے کی بند پتیوں میں شبنم جذب ہو جاتی ہے۔ کمرے کی بتیاں بجھ گئیں۔ ساز خاموش ہو گئے نواب اور شمشاد بائی صبح کے چھ بجے کمرہ سے باہر نکلے تو شمشاد کے ہاتھ میں سترہ سو روپے کے کرنسی نوٹ تھے ایک رات کی قیمت۔ جو اس نے اپنے بھائی طالب حسین کو دے دیئے اس کے بعد شمشاد کو ملتان آنے کی دعوت دی گئی چنانچہ ۷ نومبر کی شام شمشاد بائی اور اس کا بھائی طالب حسین وعدہ کے مطابق محمد نواز کے گاؤں بہادر گڑھ ملتان پہنچے لیکن محمد نواز نے ان سے کہا کہ یہاں کا ماحول کچھ سازگار نہیں کیونکہ اس کی والدہ اس کوٹھی میں رہائش پذیر تھی۔ محمد نواز نے ملتان سے جھنگ جانے کا فیصلہ کیا اور یہ ساری پارٹی دن کے ساڑھے گیارہ بجے ملتان سے ۸ نومبر کو جھنگ پہنچ گئی۔ ڈب ہاؤس پہلے سے ہی آراستہ تھا مگر محمد نواز نے فوری طور پر بعض چیزیں منگوائیں شمشاد بائی ۵ بجے شام تک ڈرائینگ روم میں رہی جہاں اس نے تمام تصویری البم دیکھ ڈالے۔ مختلف نسوانی بدنوں کے نئے زاویے اس کے مشاہدہ میں آئے۔ شمشاد کا بھائی طالب حسین ڈرائینگ روم سے ذرا فاصلہ پر ایک کمرہ میں آرام کے لئے لیٹ گیا۔

شام ذرا گہری ہوئی تو شمشاد پر غنودگی نے غلبہ پالیا اور وہ سونے کے کمرہ میں چلی گئی تھوڑی دیر بعد محمد نواز بھی اپنی خواب گاہ میں آگیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تمام کھڑکیوں کے پردے لٹکا دیئے گئے روشندان بھی بند کرا دیئے۔

رات کے دس بجے خاص ملازم محمد حسین نے دونوں کا کھانا اندر پہنچایا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔ نصف رات کے قریب خواب گاہ میں فائر کی آواز آئی جس سے محمد نواز کے دو ملازم غلام حسین عرف گامن اور محمد حسین جاگ اٹھے۔ دونوں ملازم خواب گاہ کے خفیہ راستہ سے اندر داخل ہوئے تو بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ نواز اور شمشاد دونوں ایک ہی بستر پر سوئے پڑے تھے۔ شمشاد کا سرہانہ خون سے لت پت تھا اور نواب کا ذاتی

پستول پلنگ سے کچھ فاصلہ پر دور پڑا تھا۔ فائر کی آواز سن کر نواب کا چچازاد بھائی محمد نواز بھی موقع پر پہنچ گیا اور اس نے کہا کہ جو کچھ یہاں پڑا ہے اسی طرح پڑا رہنے دو اور محمد حسین ملازم سے کہا کہ تم جھنگ کے وکیل منوہر لال کو ابھی لے کر یہاں آؤ۔

وکیل ایک گھنٹہ بعد خواب گاہ میں داخل ہوا تو اس وقت نواب محمد نواز قدرے ہوش میں آچکا تھا وکیل نے اس سے واقعہ پوچھنے کی کوشش کی مگر اس نے صرف اتنا اتنا ہی جواب دیا کہ شمشاد مر چکی ہے۔

محمد نواز کو شمشاد کی موت کا یقین تھا لیکن اس کے باوجود شمشاد کے جسم سے لپٹ کر وہ سویا رہا کبھی کبھی اس کے ابھرے ہوئے نوکیلے سینہ پر ہاتھ پھیرتا اور پھر گم سم ہو جاتا منوہر لال کے ایما پر کوتوالی پولیس کو صبح سوا پانچ بجے واقعہ کی اطلاع دی گئی۔ اس پاس کے سینکڑوں لوگ ڈب ہاؤس میں جمع ہو چکے تھے مگر وکیل نے کسی کو خوابگاہ میں جانے کی اجازت نہ دی۔ تھانیدار علی حسین جب موقع واردات پر پہنچا تو وہ خوابگاہ میں وکیل کے ہمراہ داخل ہوا۔ اس نے فرش پر پڑے ہوئے پستول کو اٹھا کر سونگھا اس میں ابھی تک بارود کی بو آرہی تھی نواب محمد نواز بدستور نعش کے ساتھ لپٹ کر سویا پڑا تھا دن کے ساڑھے بجے پولیس نے جگن ناتھ فوٹو گرافر کو بلایا جس نے دونوں کی تصویریں اتاری خوابگاہ کی کئی تصویریں بنائیں، نو بجے پولیس سپرنٹنڈنٹ سید نور حسین شاہ اور علاقہ مجسٹریٹ بھی پہنچ گئے اس وقت خواب گاہ کے سامان کا جائزہ لیا گیا تو اٹھائیس ہزار روپے کے کرنسی نوٹ، پچاس ہزار روپے مالیت کا طلائی ہار، تین بوتل شراب اور ایک بھری ہوئی رائفل ملی۔ نو بجے شمشاد کی نعش اس پلنگ سے اٹھالی گئی اور پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیج دی۔ دس بجے دن تک محمد نواز اسی خون آلود بستر پر سوتا رہا اور از خود جب بیدار ہوا تو پولیس نے اسے حراست میں لے لیا۔ ۹ نومبر کو دن کے گیارہ بجے شمشاد بائی کی نعش کا پوسٹ ڈاکٹر شیر سنگھ نے کیا اس وقت ہسپتال میں

ہزاروں شہریوں کا ہجوم تھا۔ طوائفوں اور ان کے دلالوں کے ٹولے اپنی ہم پیشہ شمشاد کے غم میں سیاپا اور آہ و فغاں میں مصروف تھے، پولیس نے ان کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا ڈاکٹر شیر سنگھ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا کہ مقتولہ کی گردن کے بائیں طرف سے گولی گزر کر دماغ کے زیریں حصہ کان کے قریب رک گئی ہے جس کی وجہ سے فوری موت واقع ہوئی اگر گولی جسم کے پار نکل جاتی تو بچ جانے کا امکان تھا۔

شمشاد کا قتل پنجاب بھر میں ایک دھماکہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لاہور کے تمام سٹوڈیو ایک دن کے لئے سوگ میں بند ہو گئے فلمی اداکاروں نے واقعۂ قتل پر احتجاج کیا اور صوبائی وزیر اعلیٰ سے ملے شاہی محلہ لاہور میں ایک ہفتہ کاروبار بند رہا۔

جب اس واقعہ کی اطلاع نواب محمد نواز کی والدہ کو ملی اس کی ممتا تڑپ اٹھی وہ سیدھی پولیس کپتان سید نور حسین شاہ کی کوٹھی پر پہنچی اور اس کے قدموں میں گر کر زار و قطار روتے ہوئے التجا کی کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے وہ مجرم اور گناہگار سہی اور اس نے ایک طوائف کو ہی قتل کیا ہے سوسائٹی کے کسی شریف انسان کو تو قتل نہیں کیا۔ خدا کے لئے اسے گرفتار نہ کرو۔ میں اپنے بیٹے کے عوض ترازو میں سونا تول کر دے سکتی ہوں لیکن پولیس کپتان نے جواب دیا تمہارا بیٹا مجرم ہے میرے پاس اس کے لئے رعائت کا کوئی خانہ نہیں وہ اس جرم میں گرفتار ہوگا۔ یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ اسے بے گناہ قرار دیتی ہے یا مجرم۔ چنانچہ پولیس کپتان کے خصوصی حکم پر نواب محمد نواز کو گرفتار کر کے ریمانڈ جوڈیشل پر اسی دن جھنگ جیل بھیج دیا گیا جہاں وہ تین ہفتہ رہا اس دوران سیشن جج جھنگ نے ڈاکٹری رپورٹ کی بنیاد پر اسے ضمانت پر رہا کر دیا رہائی کے بعد محمد نواز ڈب کلاں چلا آیا لیکن شمشاد کے ورثا نے ہائی کورٹ میں ضمانت منسوخی کی درخواست پیش کی جس پر ہائی کورٹ نے سیشن جج جھنگ کی ضمانت منسوخ کر دی اور گرفتار کر کے میو ہسپتال میں علاج کے لئے داخل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ۲۸ دسمبر

۱۹۴۱ء کو محمد نواز پابند سلاسل میو ہسپتال میں داخل ہو گیا۔

مقدمہ کی ابتدائی سماعت جھنگ کے علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں شروع ہوئی وکیل صفائی کے فرائض میاں محمد امین ایم اے بار ایٹ لا۔ شیخ محمد یوسف شاہ قریشی بار ایٹ لا۔ دیوان منوہر لال ایڈووکیٹ نے انجام دیئے لیکن محمد نواز ان وکلا پر مطمئن نہ تھا اس نے شیخ محمد یوسف شاہ سے کہا کہ وہ بمبئی جا کر قائد اعظم محمد علی جناح سے بات کرے چنانچہ یوسف شاہ بمبئی گئے قائد اعظم کو مقدمہ کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ قائد اعظم نے ایک لاکھ روپیہ پیشگی۔ ہوائی جہاز کے ذریعہ آمد و رفت کا خرچہ اور بیس ہزار یومیہ طلب کیا۔ یوسف شاہ مرحوم نے قائد اعظم سے کہا کہ وہ متعلقہ پارٹی سے معاملہ طے کر کے مطلع کریں گے۔

محمد نواز ڈب نے بخوشی یہ فیس ادا کرنے کی حامی بھر لی لیکن اس کی والدہ جو خود بھی عہد جوانی میں خاصی شہرت یافتہ تھی نے اتنی فیس دینے سے معذوری ظاہر کر دی۔ بعض اصحاب کی روایت ہے کہ ہندو وکلا نے در پردہ محمد نواز کی والدہ کو آمادہ کر لیا تھا کہ قائد اعظم کو اس مقدمہ کی پیروی کے لئے نہ بلایا جائے۔ ہندو وکلا کو خدشہ تھا کہ مسلم لیگ کی تحریک جھنگ میں ان کی آمد کی وجہ سے زیادہ موثر ہو جائے گی۔

ایک طرف قائد اعظم مقدمہ کی پیروی کے لئے جھنگ نہ آسکے، دوسری طرف پولیس کپتان سید نور حسین شاہ نے حکومت پر زور دیا کہ وہ جھنگ کے ڈپٹی کمشنر بلونت سنگھ نلوہ کو یہاں سے فوراً تبدیل کر دے کیونکہ وہ مقدمہ پر اثر انداز ہو رہا ہے اس نے ملزم فریق سے گہرے مراسم پیدا کر لئے ہیں یہاں تک کہ مقدمہ کے ملزم محمد نواز نے پچپن ہزار روپیہ مالیت کی نئی کار ڈپٹی کمشنر کو دے دی ہے چنانچہ پولیس کپتان کی رپورٹ پر چیف سیکرٹری نے ڈپٹی کمشنر کو تبدیل کر دیا اور اس کی جگہ پر انگریز ڈپٹی کمشنر تعینات ہوا۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ سید نور حسین شاہ انتظامی معاملات میں اس قدر سخت تھا کہ محرم کے دنوں میں ایک سال تعزیہ کے جلوس نہ نکلنے دیئے کیونکہ

تعزیہ داروں نے فرقہ دارانہ کشیدگی کی بنا پر بروقت تعزیہ نہیں اٹھایا تھا۔

ماتحت عدالت میں جن لوگوں نے بیانات قلمبند کرائے ان کا ماحصل نقل کر رہا ہوں

- محمد نواز ڈب نے عدالت کو بتایا کہ یہ بات درست ہے کہ شمشاد میرے مکان پر قتل ہوئی اور میرے ہی پستول سے اسے گولی لگی لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور شمشاد نے میری درخواست قبول کر لی تھی مجھے شمشاد کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی البتہ میری وسیع تر جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے میرے مخالفین نے یہ سازش تیار کی، شمشاد کو ان لوگوں نے قتل کیا اور مجھے اس مقدمۂ قتل میں پھنسوا دیا تاکہ میری وسیع تر جائیداد پر خود قبضہ کریں کیونکہ میرے مخالفین نے میری جائیداد کو کورٹ آف وارڈز میں لانے کیلئے پہلے ہی درخواستیں دے رکھی ہیں میرے مخالف بھی اسی مکان میں رہتے ہیں جہاں یہ واردات ہوئی بلکہ میں نے گولی کی آواز سن کر اپنے ملازم گامن کو بلایا تھا مجھے شبہ ہے کہ اس قتل میں میرے مخالف محمد نواز ثانی کا ہاتھ ہے جو اس روز یہیں تھا یا اس کا کوئی کارندہ غسل خانہ کے ذریعہ میری خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے فائر کیا گولی کی آواز سن کر میں بیدار ہوا اور اپنے ملازم کو بلایا۔
- عدالت کے دوسرے گواہ گامن نے اپنے بیان میں کہا کہ گولی کی آواز سن کر وہ خواب گاہ کی طرف گیا تو شمشاد قتل ہو چکی تھی اور نواب کا چچازاد بھائی محمد نواز وہاں پہنچ چکا تھا اسی کے ایما پر منوہر لال وکیل کو بلایا گیا۔
- عدالت کے تیسرے اہم گواہ محمد نواز ثانی نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ ملزم میرا ہی چچازاد بھائی ہے مجھے اس کی عیاشیوں کی وجہ سے شکایت تھی اور میں اس کا مخالف تھا ملزم نے ابھی چند ماہ پہلے تین لاکھ روپے کی جائیداد فروخت کی اور سارا روپیہ عیاشی کی نذر کر دیا اس کی وسیع جائیداد کو بچانے کے لئے میں نے حکومت کو

درخواست دی تھی کہ وہ کورٹ آف وارڈز میں اسے لے لے۔

۶ عدالت کو مقتولہ کے حقیقی بھائی طالب حسین نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ مجھے قتل کی رات آٹھ بجے مقتولہ نے آکر بتایا تھا کہ میں نواب ... کے طرزِ عمل سے مطمئن ہوں اور نواب نے اسے شب بسری سے قبل اٹھارہ سو روپے دیئے ہیں۔

ابتدائی عدالت نے ملزم محمد نواز ڈب کو سیشن سپرد کر دیا چنانچہ استغاثہ نے مقدمہ کے انتقال کی درخواست دی۔ ہائی کورٹ نے منظور کر لی اور مقدمہ سیشن جج جھنگ کی بجائے سیشن جج لاہور کے پاس سماعت کے لئے بھیج دیا گیا۔

مسٹر فال شاہ ڈسٹرکٹ سیشن جج لاہور نے ۲۶ رمئی ۱۹۴۲ء کو مقدمہ کی سماعت کی اور ۷ رجون ۱۹۴۲ء کو اس اہم مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا۔ سیشن عدالت کی جیوری کے چار ممبروں نے عدالت کو مشورہ دیا کہ استغاثہ قتل کا مقصد واضح کرنے میں ناکام رہا ہے لہٰذا ملزم اس امر کا مستحق ہے کہ اسے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا جائے لیکن سیشن جج نے چھتیس صفحہ کے اس فیصلہ میں لکھا کہ گو استغاثہ قتل کا واضح مقصد ثابت نہیں کر سکا لیکن قتل تو ہوا ہے اور جن حالات میں ہوا اس کا تقاضا ہے کہ ملزم کو سزا دی جائے۔ میں ملزم کی جسمانی صحت کے پیشِ نظر اسے عمر قید کی سزا کا حکم دیتا ہوں۔

عدالت کے اس فیصلہ کے خلاف نواب محمد نواز ڈب نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی جو سماعت کے لئے منظور ہو گئی مگر ابھی سماعت شروع نہیں ہوئی تھی کہ ۷ رجولائی ۱۹۴۲ء کو محمد نواز میو ہسپتال میں فوت ہو گیا۔

عام طور پر تاثر یہی لیا جاتا ہے کہ شمشاد بائی کا قاتل نواب ڈب تھا اور قتل کی فوری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مقتولہ جسمانی اعتبار سے بہت شوخ اور چلبلی تھی مگر نواب ڈب کی جسمانی صحت کمزور ہو چکی تھی پھر شراب کی زیادتی کے باعث وہ شمشاد کی شوخیوں کا جواب دینے سے قاصر رہا اس شدید احساس کمتری سے مغلوب ہو کر نواب نے جھنجھلاتے

ہنستے شمشاد کو قتل کر دیا گو یہ تاثر بڑا جذباتی ہے لیکن بعید نہیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ محمد نواز اعصابی طور پر بے حد کمزور ہو چکا تھا اور اس نے انگریز معالجوں کے مشورہ سے عیاشی کے لئے الیکٹرونک سسٹم بنایا ہوا تھا یعنی وہ جس وقت مجامعت کرنا چاہتا ایک آٹومیٹک مشین سے بجلی کا کنکشن جوڑ دیتا اور پھر اس مشین سے ایک باریک سا تار لے کر اپنے اعضاء تناسل سے باندھ دیا کرتا جس سے اس میں مردانی قوت آجاتی تھی۔ شمشاد کو لاہور کے فلیٹی ہوٹل میں اس سسٹم کا تجربہ ہو چکا تھا وہ اس کے ذریعہ مجامعت کے لئے تیار نہ تھی اور محمد نواز جذبات شہوانی سے مغلوب تھا اس نے غصہ میں شمشاد پر فائر کر دیا۔

قتل کی اصل وجہ کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ عدالتیں بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکیں، مختلف روائتیں اور کہانیاں ہیں جو شمشاد کے قتل سے شروع ہوئیں اور آج تک لوگوں کے دماغوں اور زبانوں پر ہیں۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ محمد نواز کی موت کے بعد اس کی واحد لڑکی جو اپنے ننہال میں پرورش پاتی رہی جب جوان ہوگئی تو ۱۹۵۳ء میں جھنگ کے ایک ڈپٹی کمشنر نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس کے لڑکے سے شادی کرے لیکن وہ نہ مانی اور اسی وجہ سے خزانہ میں محفوظ دولت جو محمد نواز کے قتل کے بعد رکھی گئی تھی اسے واپس نہ مل سکی اس لڑکے کے رشتہ پر بھی طویل جھگڑا چلتا رہا۔

۱۹۵۵ء میں کراچی کے ایک شخص محمد اقبال نے دعویٰ کیا کہ وہ محمد نواز ڈب کا حقیقی بیٹا اور جائیداد کا واحد وارث ہے لہذا جائیداد اُسے ملنی چاہیئے اس کا یہ دعویٰ عدالتوں میں زیر سماعت رہا۔ بعد میں معلوم نہ ہوا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔

نواب طاہرہ بیگم

حسن وجمال اور جاہ وحشمت کی تصویر نواب طاہرہ بیگم بنت نواب احمد خان سیال رئیس حکومت جھنگ ناز ونعم میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ سیالوں کی غیرت، حسن اور بہادری کا یہ حسین مرقع اپنے عہد کی عظیم عورت تھی جس نے باپ کے مصنوعی وقار اور شخصی مرتبہ کی پروا کئے بغیر اپنے مستقبل کا وہ راستہ منتخب کیا جس پر خاروں کا دور تک جال پھیلا ہوا تھا ایسا راستہ جو دنیا دی روشنیوں اور رونقوں سے تہی داماں تھا نواب طاہرہ بیگم نے محلوں کی آسائش۔ آرام اور سکون کو ترک کر کے جلاوطنی کی اداس اور ویران زندگی کیوں پسند کی۔ اس لئے کہ اس کے اندر کی سوئی ہوئی گرہستی عورت جاگ پڑی تھی۔ عورت کی وہ خوبیاں جو وفا۔ خدمت۔ وقار اور وعدہ ایفائی سے عبارت ہیں اس کے دل ودماغ میں انگڑائیاں لے کر بیدار ہو گئی تھیں یہ صحیح عورت ایک وقت میں دو شوہروں کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ عورت کے لئے اس سے زیادہ کوئی کام نکروہ اور کوئی فعل اور گناہ سنگین نہیں کہ ماں باپ نے اس کا دامن جس پلو سے باندھ دیا ہو وہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کسی جذباتی اور سفلی کیفیت کی وجہ سے کھینچ لے وقتی وقار کی خاطر اپنا دامن اس مرد کے پلو سے جبریہ چھڑانے کی جہاں کوشش ہوگی عورت کی غیرت اسے برداشت نہیں کرے گی کیونکہ اس کی انا جاگ اٹھتی ہے اور اس کے اندر کی گرہستی عورت بیدار ہو کر سوچتی ہے کہ والدین کا پہلا فیصلہ بھی اس کی مرضی کے بغیر ہوا تھا اور اب دوسرا فیصلہ بھی اس کی منشا کے بغیر کیا جا رہا ہے۔

جبکہ پہلے فیصلہ کو منسوخ کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی اخلاقی جواز بھی نہیں تو ایسی صورت میں عورت کون سی راہ اختیار کرے۔

طاہرہ بیگم نے وہی راستہ اختیار کیا جو شریف عورتوں کے لئے متعین ہے خواہ اس منزل میں اس کے پاؤں چھلنی ہوئے راج محلوں سے محروم ہوئی۔ جھنگ سے کابل تک کا سفر پا پیادہ طے کیا اور جلا وطنی کی زندگی گزار کر دیار غیر میں ہی موت کی نیند سو گئی کابل کے ہزاری باغ کے قبرستان میں نواب طاہرہ بیگم کا مرقد آج بھی سوالیہ نشان کی صورت میں موجود ہے اور اس پر نصب شدہ کتبہ اس کی نسوانی غیرت کا منہ بولتا عنوان ہے۔ نواب طاہرہ بیگم کون تھی؟ اسے کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ وفا اور بہادری کی اس داستان کا پس منظر سیاسی بھی ہے اور روحانی بھی۔ اس کہانی کا اجمال یہ ہے کہ جھنگ کے رئیس حکومت نواب کبیر خان کے تین لڑکے تھے۔ ان میں احمد خان کو حکومت و سرداری کا والد کی زندگی میں ہی اس قدر جنون تھا کہ وہ ہمیشہ حیلے بہانے سوچتا رہتا کہ وہ اپنے والد کو تاج و تخت سے محروم کر کے کیسے حکمران بنے؟

احمد خان کی اس سازش میں ریاست کا دیوان شیو داس بھی شریک تھا شیو داس کو احمد خان نے یہ لالچ دیا تھا کہ اگر اس کا والد از خود تمہاری تجویز سے اس کے حق میں دستبردار ہو جائے تو وہ شیو داس کے سرکاری اختیارات میں مزید اضافہ کر کے مستقل جاگیر بھی عطا کریگا اور دیوان شیوداس نے احمد خان کو مکمل تعاون کا یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی خواہش کی تکمیل کے لئے پوری قوت صرف کرے گا چنانچہ کئی دنوں کی سوچ کے بعد اس نے تجویز پیش کی کہ تم والد سے ناراض ہو کر کسی دوسرے گاؤں میں چلے جاؤ تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری ناراضگی کے پس منظر سے وہ نواب کبیر خان کو آگاہ کر کے اسے اس بات پر آمادہ کروں گا کہ وہ تمہیں منائے اور اپنے تاج و تخت سے تمہارے حق میں از خود دستبردار ہو جائے۔ شیو داس چونکہ کبیر خان کا سیاسی و مالی مشیر تھا اسے مکمل یقین تھا

کہ کبیر خان اس کی بات نہیں ٹال سکے گا اور اس کا مشورہ لازمی قبول کرے گا۔ لہٰذا طے شدہ پروگرام کے مطابق احمد خان ناراض ہو کر جھنگ سے قادر پور چلا گیا اور وہیں ڈیرہ لگا لیا۔ قادر پور بھی کبیر خان کی ریاست کا حصہ تھا یہاں کے لوگوں نے احمد خان کی بڑی قدر کی اور اسے نوابانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرنے کی تمام سہولتیں فراہم کیں۔

نواب کبیر خان چونکہ فطری طور پر اولاد کے معاملہ میں نہایت نرم دل تھا اس نے اپنے باقی دو لڑکوں کو بھی اس بات پہ آمادہ کر لیا کہ احمد خان کو منایا جائے اور اس کی ہر خواہش پوری کی جائے دوسری طرف دیوان شیوداس بھی احمد خان کی خوبیوں اور امور ملکی میں مہارت کی تعریف و توصیف کر کے اسے قائل کر چکا تھا کہ احمد خان کو ہر صورت اور ہر قیمت پر منایا جائے چنانچہ شیوداس نواب کبیر خان کو لے کر قادر پور پہنچا احمد خان کو اس نے پہلے کہلا بھیجا تھا کہ وہ اپنے والد کا گرم جوشی سے استقبال کرے۔

کبیر خان جب قادر پور پہنچا تو احمد خان نے خوب استقبال کیا۔ کھانے کی دعوت دی اس میں علاقہ کے تمام رؤسا اور درباری بھی موجود تھے۔ کبیر خان نے بیٹے کو منایا اور بھری مجلس میں کہا کہ آج سے جھنگ کا حکمران میرا بیٹا احمد خان ہے میں اپنی تلوار اور دستار اس کے سپرد کرتا ہوں۔

نواب کبیر خان کو گمان تھا کہ جب وہ اعلان کرے گا تو احمد خان کو شرم محسوس ہوگی کہ باپ کی موجودگی میں وہ اس کی تلوار اور دستار کیوں لے۔ کیونکہ ایسا کرنا سیالوں کی خاندانی روایت کے خلاف تھا۔ لیکن کبیر خان کا یہ گمان غلط نکلا۔ احمد خان نے باپ کے منہ سے الفاظ نکلتے ہی اس کی دستار اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی اور باپ کی تلوار اپنے ٹیکے میں لٹکالی۔

احمد خان کی یہ حرکت دیکھ کر رؤسا اور درباری حیران رہ گئے خود کبیر خان دم بخود ہو گیا کہ احمد خان نے ایسا کیوں کیا۔ چونکہ دیوان شیوداس درمیان میں ایک چالاک آدمی موجود

تھا اس نے حالات بھانپ کر فوراً اسی مجلس میں نواب کبیر خان کی تعریف و توصیف کر کے احمد خان سے کہا کہ اب وہ خود کو اپنے باپ کا صحیح جانشین ثابت کرنے کی کوشش کرے تاکہ سیالوں اور رعایا کو یہی گمان ہو کہ وہ اپنے والد کی ہدایات کے مطابق حکومت کر رہا ہے

احمد خان حکمرانی کی سند لے کر جھنگ آگیا اور کبیر خان دل برداشتہ ہو کر اچ گل امام کے سجادہ نشین سید نور شاہ کے پاس فرد کش ہو گیا۔ احمد خان حکمران بننے سے پہلے شادی شدہ تھا اور اس کی اولاد میں عنایت خان اور نواب طاہرہ بیگم اس وقت شباب کی منزل میں تھے۔ نواب احمد خان نے وعدہ کے مطابق دیوان شیوداس کے مالی اختیارات وسیع کر دیئے اور مزید جاگیر بھی عطا کر دی۔ چند سال تک عملاً شیوداس ہی حکمران رہا۔ اس دوران نواب احمد خان کو معلوم ہوا کہ دیوان شیوداس کے پاس ایک خوبصورت طوائف راجاں بطور داشتہ موجود ہے جس کے حسن کا دور دور تک شہرہ تھا۔ نواب احمد خان کے دل میں اسی وقت میل آگئی پہلے تو گفتگو کے ذریعے اس نے دیوان شیوداس کو آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ راجاں کو اس کے حوالہ کر دے لیکن وہ انکاری رہا پھر احمد خان نے راجاں کو خفیہ ذرائع سے اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی مگر وہاں بھی اُسے ناکامی ہوئی پھر اس نے دیوان شیوداس کو راستہ سے ہٹانے کیلئے سازش سوچی جس کے مطابق احمد خان نے اس پر سرکاری خزانہ میں خیانت اور غبن کا الزام عائد کر کے قید کر دیا اور خود تحقیقات کر کے اس کے ذمہ دس ہزار روپیہ نکالا جو اس نے خلاف قاعدہ خزانہ سے حاصل کیا تھا۔ جونہی شیوداس قید خانے پہنچا احمد خان نے اس کی داشتہ راجاں کو اپنے حرم میں شامل کر لیا جس کا احمد خان کی پہلی بیوی اور اولاد کو شدید رنج ہوا وہ ناراض ہو کر نواب کبیر خان کے پاس اچ گل امام چلے گئے احمد خان نے موقع غنیمت جان کر راجاں سے باقاعدہ نکاح کر لیا اب محل کی کار مختار وہی بن گئی دوسری طرف احمد خان نے دیوان شیوداس کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ شیوداس کو قید خا

سے نکال کر جیون خان نامی بلوچ کے گھر نظر بند کر دیا گیا جہاں خفیہ فیصلہ کے مطابق جیون خان نے اسے قتل کر دیا۔

نواب احمد خان ادھر سے مطمئن ہوا تو اسے یہ احساس ہوا کہ دیوان شیوداس جو اس کے والد کا قابل اعتماد تھا، کے قتل کا اور کوئی ردعمل نہ بھی ہوتا مگر نواب کبیر خان اسے لازماً بُرا منائے گا اور ہو سکتا ہے کہ راجاں سے نکاح کرنے کے جرم میں وہ جھنگ آ کر مجھے تخت و تاج سے محروم کر دے اس کے لئے اُچ میں نواب کبیر خان اپنے ہمنواؤں کی فوج بھی بآسانی فراہم کر سکتا ہے۔ اس خدشہ کے پیش نظر احمد خان نے اپنے والد کے پاس ایک وفد بھیجا اور درخواست کی کہ وہ اُچ سے جھنگ آ کر قیام کریں۔ احمد خان سمجھتا تھا کہ وہ کبیر خان کو اپنی نگرانی میں رکھ کر اس کی رہی سہی قوت کو کو ختم کر سکتا ہے مگر احمد خان کا وفد ناکام واپس آ گیا۔ فقیر اُچ گل امام نے بھی اصل صورت حال کو محسوس کر لیا تھا۔

اب حالات احمد خان کے اور بھی مخالف ہو گئے تھے اور اسے یقین تھا کہ رعایا بھی اس کی مخالف ہے اور رؤسا بھی پہلے ایسے وفادار نہیں رہے ہیں اس نے پھر کبیر خان کو منانے اور بچوں سمیت واپس جھنگ لانے کی کوشش کی۔ مگر اس دفعہ بھی ناکام رہا۔ نیز احمد خان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی بیوی اور کبیر خان نے نواب طاہرہ بیگم کا رشتہ سجادہ نشین اُچ کے ایما پر ہوت خان کھیڑا رئیس رنگ پور کے لڑکے ہیبت خان سے طے کر دیا ہے۔ احمد خان گو اس رشتہ کے حق میں تھا اور شروع سے اس کی نیت یہی تھی لیکن اس کام کے لئے وہ خود اپنے سر پگڑی باندھنا چاہتا تھا تاکہ سیاسی اعتبار سے کھیڑے اس کے ہم خیال ہو جائیں۔

احمد خان نے نواب طاہرہ بیگم کی منگنی کی خبر سن کر اپنے ایک سالار احمد شاہ قریشی آف حویلی بہادر شاہ کو اُچ گل امام کے اردگرد دیہاتوں میں لوٹ مار کرنے کا

حکم دے دیا۔ کیونکہ وہ اس طرح فقیر اُچ کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ احمد شاہ کی لوٹ مار سے لوگ تنگ آ کر اُچ کے قلعہ میں پناہ لینے لگے۔ احمد شاہ نے نواب احمد خان کو اکسایا کہ اس سے بہتر موقع اور نہیں ہوگا کہ قلعہ اُچ کا محاصرہ کر لیا جائے اور فقیر کو مجبور کیا جائے کہ نواب کبیر خان اور اس کے دیگر افراد کنبہ کو احمد خان کے حوالہ کر دے مگر فقیر اُچ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کبیر خان کو جبریہ قلعہ سے نکال کر احمد خان کے حوالہ کرے یہ بات اس کی درویشی اور وضعداری کے خلاف تھی اس نے محاصرہ اور مقابلہ کی صورت منظور کی لیکن کبیر خان کو اپنی پناہ سے باہر نہ کیا۔ احمد خان نے دو ماہ تک قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا مگر اسے فتح نہ کر سکا بالآخر ہر دو فریقین کے درمیان سمجھوتا ہوا۔ جس کے تحت احمد خان کی بیوی لڑکا اور لڑکی اس کے حوالہ ہو گئے۔ کبیر خان کے بارے میں طے ہوا کہ وہ اُچ میں نہیں رہے گا اور نہ ہی جھنگ جائیگا بلکہ وہ ہوت خان کھیڑہ کی ریاست رنگپور میں قیام کرے گا احمد خان نے یہی غنیمت سمجھا اور کبیر خان کو کھیڑوں کے پاس جانے کی اجازت دے دی

جھنگ آنے کے بعد نواب احمد خان نے دربار میں اعلان کیا کہ میری لڑکی طاہرہ بیگم کی منگنی میرے والد نے ہیبت خان کھیڑا سے کر دی تھی لیکن مجھے یہ رشتہ منظور نہیں میں اس رشتہ کو منسوخ کرتا ہوں اور اس نے خصوصی قاصد کے ذریعے مذکورہ اطلاع رنگ پور میں کبیر خان اور ہیبت خان کے پاس بھجوا دی۔ ان کے لئے یہ اطلاع غیر متوقع نہ تھی انہیں اس بات کا پہلے ہی سے ڈر تھا۔ لیکن اب طاہرہ بیگم ان کی عزت تھی وہ نواب احمد خان کی بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف نواب طاہرہ بیگم نے اپنے باپ کے اس فیصلہ کو مسترد کر دیا اور باپ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میری شادی کسی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ عورت کے لئے دو خاوندوں کا تصوّر حرام ہے۔ میرے لئے میری ماں بھائی اور دادا نے جو فیصلہ کیا تھا وہی قائم رہے گا میں اس قسم کا طعنہ نہیں سن سکتی کہ لوگ کہیں کہ احمد خان کی بیٹی کی منگنی ٹوٹ

گئی تھی اور دوسری جگہ بیاہی گئی یہ عورت کی عزت اور شان کے خلاف ہے۔ ہیبت خان کیسا ہی سہی مگر اب میں اس سے منسوب ہو چکی ہوں سفید داڑھیوں نے زبان کر دی ہے اب میں اس کی لاج رکھوں گی اور یا دوسری منگ سے پہلے میری لاش ملے گی۔

نواب احمد خان کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس کی بیٹی اس کا کہا ٹھکرا دے گی اس نے پہلے تو طاہرہ کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ کسی طرح تیار نہ ہوئی تو اسے قید میں ڈالنے کی دھمکی دی۔ مگر طاہرہ بیگم قید کے لئے بھی تیار تھی احمد خان ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا وہ سمجھتا تھا کہ دنیا کے ہر محاذ پر وہ کامیابی حاصل کر چکا ہے یہاں تک کہ باپ سے تاج و تخت چھین لیا اور اسے ریاست بدر ہونے پر مجبور کیا مگر طاہرہ کا معاملہ ایسا تھا کہ اسے اپنی شکست نظر آ رہی تھی۔

دوسری طرف نواب کبیر خان رنگ پور میں فوت ہو گیا۔ کھیڑے اس کی لاش اعزاز کے ساتھ جھنگ لائے اور اسے دفن کیا۔

کبیر خان کی فاتحہ خوانی کی رسم پر ہوت خان کھیڑا نے نواب احمد خان سے طاہرہ کے نکاح کی بات چھیڑی جس پر احمد خان سخت برافروختہ ہوا اور اس نے بھری مجلس میں ہوت خان کے بیٹے ہیبت خان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ہیبت خان چونکہ تنہا تھا وہ مزاحمت نہ کر سکا۔ احمد خان کا یہ فعل سفارتی آداب کے بھی منافی تھا لیکن اقتدار کے نشہ میں ایسا بدمست تھا کہ گردو پیش کا جائزہ نہ لے سکا اور نہ ہی معاملہ کی نزاکت کو محسوس کیا ہوت خان واپس رنگ پور چلا گیا۔

معاملہ کی صورت خراب تھی۔ کھیڑوں نے احمد خان سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا اور فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس وقت احمد خان کی ریاست کا دائرہ خاصا وسیع تھا اور اسے شکست دینے کے لئے بھاری تیاری کی ضرورت تھی۔ احمد خان بھی بے خبر نہ تھا دونوں ریاستوں کے رئیس مقابلہ کی ٹھان چکے تھے کہ نواب طاہرہ بیگم نے اپنی ماں اور

کی اقتصادی، معاشی اور سماجی مشکلات بھی اس کے قدم نہ روک سکیں ؟ بالآخر وہ کون سے اسباب و عوامل تھے جن کے باعث عالم خان نے ان تمام متوقع خطرات و مشکلات کے باوجود اس بھیانک داستان کی ابتدا خون سے کی۔ جس کی انتہا اس کے اپنے خون پر ہوئی۔ عالم خان ایک دیندار مسلمان تھا وہ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے پولیس کی ملازمت میں داخل ہوا تھا حالانکہ وہ انگریز کو مذہبی اعتبار سے انتہائی نجس اور کینہ دشمن سمجھتا تھا اور اپنی ساری ملازمت کے دوران اسے پہلی بار ایک انگریز پولیس کپتان کی زبان سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں گندی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ جس کے بعد وہ انگریز کا اور بھی پکا دشمن ہوگیا۔ چونکہ عالم خان ملازمت کے سلسلہ میں نہایت دیانتدار اور فرض شناس مشہور تھا اس لئے پولیس کے بڑے افسر عموماً اسے اپنے پاس رکھنا پسند کرتے تھے۔ این ٹی راتن ایک جغادری پولیس کپتان ۱۹۱۱ء میں جھنگ تعینات ہوا، اور جھنگ کا پولیس کانسٹیبل عالم خان اس کی ذاتی گارڈ میں شامل کر لیا گیا۔ ان دنوں پولیس کے اعلیٰ حکام کا یہ معمول تھا کہ وہ جہاں کسی علاقے یا تھانہ میں سرکاری کام کے لئے جاتے اپنے خاص حفاظتی گارڈ اور عملہ کے علاوہ ریزرو سے بھی ایک گارڈ ان کے ساتھ جاتی، اکثر اوقات مجرمان کی گرفتاریاں وغیرہ ان کی موجودگی میں ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانہ میں آبادی کی یہ ریل پیل نہ تھی جو آج ہے اور نہ ہی عام لوگوں کا معیار زندگی اس قدر بلند تھا جو آج پایا جاتا ہے اسی طرح انسانی مسائل بھی محدود تھے اور وسائل بھی محدود۔ تاہم جرائم کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔

انگریز حاکم خصوصیت کے ساتھ ہر جگہ عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کے ذہن و فکر کی تبدیلی کے لئے کوشاں رہا کرتے تھے یہاں تک کہ ماتحت ملازمین کے انداز فکر و نظر پر گہری نگاہ رکھتے تھے بلکہ ان کو اپنے حسب حال بدلنے کے طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔

سؤر کا قتل



ایک حرام جانور کا قتل، قتل کے ضمن میں کیونکر آسکتا ہے؟ سوٗر مارنے والے کو قاتل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہاں سوٗر سے مراد ایک انگریز پولیس کپتان ہے اور اس کا قاتل ایک مسلمان پولیس کانسٹیبل عالم خان۔

عالم خان ایک فٹ کانسٹیبل تھا جسے پہلے زمانہ میں شتر سوار کہا جاتا تھا ایک پولیس کانسٹیبل کی پولیس کپتان کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہو سکتی ہے جبکہ کپتان انگریز ہو اور برطانوی حکومت کا بھرپور عہد۔ اس وقت کسی کانسٹیبل کے بارے میں یہ تصور بھی ممکن نہیں کہ وہ ضلع میں پولیس کے اعلیٰ ترین افسر کو قتل کر دے جبکہ اسے اپنی بھیانک موت بھی نظر آرہی ہو۔

عالم خان کو یہ حوصلہ کیوں پڑا؟ قتل کی وجوہات کیا تھیں؟ کیا اسے اپنی موت کی یقینی علامتیں نظر نہیں آرہی تھیں؟ کیا پھانسی کا پھندا اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا برطانوی حکومت کا جبر و تشدد بھی اسے اس عزم سے نہ روک سکا، اپنے بیوی بچوں

بھائی عنایت خان کے ذریعہ ہیبت خان کو قید خانہ سے آزاد کرا لیا چند دن دونوں محل میں پوشیدہ رہے اور پھر موقع پا کر وہاں سے بھاگ نکلے۔

طاہرہ بیگم اور ہیبت خان رنگ پور پہنچے جہاں دونوں کا نکاح ہوا اور پھر دونوں افغانستان پہنچے بقیہ عمر ان کی وہیں گزری۔

کابل کے حکمرانوں کا جھنگ کے حکمرانوں سے سفارتی سطح پر تعلق پہلے ہی سے تھا امیر کابل دوست محمد خان کے دادا جہان خان عنایت اللہ خان رئیس جھنگ کے عہد میں جھنگ آ چکے تھے بلکہ ان کی ہمشیرہ کا رشتہ بھی طلب کیا تھا مگر عنایت اللہ خان نے معذوری کا اظہار کر دیا تھا۔ حکومت کابل نے نواب طاہرہ بیگم اور ہیبت خان کو کچھ روز بطور شاہی مہمان رکھا اور پھر ہیبت خان کو کچھ خصوصی مراعات دے کر فوج میں بھیج دیا۔

بیس برس تک میاں بیوی کابل میں رہے۔ ہیبت خان ایک فوجی مہم میں جاں بحق ہو گیا۔ طاہرہ بیگم اب تنہا تھی۔ غریب الوطنی۔ تنہائی اور خاوند کی مفارقت نے اس کے احساسات کا دائرہ اتنا تنگ کر دیا کہ چند ماہ بعد وہ بھی خالق حقیقی کے پاس جا پہنچی۔

دونوں میاں بیوی کے مزار کابل کے ہزاری باغ کے قبرستان میں موجود ہیں اور دونوں قبروں پر مشترکہ کتبہ نصب ہے جس پر جلاوطن نواب طاہرہ بیگم کا تذکرہ کندہ ہے

این ٹی رائن سرکاری کام کی پڑتال کے سلسلہ میں بھوانہ پہنچا۔ گاؤں کے باہر ایک آراستہ حویلی میں جہاں گھنے درختوں کی چھاؤں تھی اس نے اپنا خیمہ لگایا خیمہ کے سامنے ایک مسلح سپاہی پہرہ پر رہتا تھا۔ دوسرے روز ہی عالم خان کی ڈیوٹی خیمہ کے پہرہ پر لگی اس کا پہرہ دوپہر بارہ بجے سے شام چھ بجے تک تھا۔ جب عالم خان کے پہرہ کا وقت شروع ہوا تو پولیس کپتان کاغذات دیکھنے میں مصروف تھا۔ قریباً ایک بجے اس نے کھانا کھایا اور پھر خیمہ کے اندر آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ عالم خان نے جب دیکھا کہ وہ آرام کر رہا ہے اس نے رائفل خیمہ کے ساتھ رکھدی اور وضو کر کے خیمہ کے باہر ظہر کی نماز پڑھنے میں مصروف ہوگیا، اِسے اطمینان تھا کہ کپتان اب سو جائے گا اس دوران وہ نماز کا فریضہ ادا کرے۔

عالم خان ابھی نماز میں مصروف تھا کہ کپتان نے اُسے آواز دی۔ سنتری ..... مگر سنتری نماز میں مصروف تھا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کپتان نے تھوڑی دیر بعد پھر آواز دی مگر اس دفعہ بھی اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کپتان غصہ سے بھرا ہوا باہر نکلا تو عالم خان نماز میں مصروف تھا۔ کپتان کے دماغ میں یہ خیال تھا کہ سنتری کی کیا مجال ہے کہ کپتان اسے بلائے اور وہ حاضر نہ ہو، اور پھر کپتان اس کے سامنے کھڑا ہو تب بھی وہ اٹھ کر سلام نہ کرے۔ این ٹی رائن کو غالباً اس قسم کے واقعہ سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا یا اس نے جان بوجھ کر ایک مسلمان سپاہی کو آزمائش میں ڈالنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ این ٹی رائن کو ایک دم غصہ آگیا اور اس نے نماز میں مصروف عالم خان کو پہلے ایک گالی دی پھر مسلمانوں کو سؤر کے بچے کہا۔ مگر اس کا دل ابھی نہ بھرا تھا کہ اس نے اُس کی پشت پر پاؤں سے ٹھوکر ماری۔ اس اثنا میں گارد کے کچھ اور ملازمین بھی وہاں پہنچ گئے ان کو یقین تھا کہ عالم خان کی نہ صرف ملازمت ختم ہو جائے گی بلکہ حکم عدولی کی بنا پر اسے سزا بھی ملے گی اس گارد میں مسلمان کانسٹیبل بھی تھے ان کے دل میں عالم خان سے اتنی ہمدردی ضرور تھی کہ وہ صاحب سے معافی مانگ کر معاملہ یہیں ختم کر دے۔

عالم خان نماز سے فارغ ہوگیا۔ اس نے اٹھ کر سلام کیا لیکن این ٹی رائن نے اسے

پھر گالی دی اور ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پہ مارا۔

عالم خان نے جواب میں کہا جناب آپ آرام کر رہے تھے میں نے نماز کا فریضہ ادا کر لیا یہ میرا معمول ہے میں نماز قضا نہیں کیا کرتا آپ سے پہلے جو افسر آتے رہے وہ بھی مجھے یہ رعائت دیتے تھے۔ اس کے جواب پر پولیس کپتان اور بپھر گیا اس نے اسی وقت اسے معطل کر دیا اور کہا اس سؤر کے بچے کو میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ مسلمان سارے اسی قسم کے ہیں ان کے دماغوں میں ابھی تک اپنی حکومت کا گمان سمایا ہوا ہے۔

عالم خان سے رائفل رکھوا لی گئی۔ گارد کے افسروں اور سپاہیوں نے عالم خان کو بہت سمجھایا کہ تم غریب ہو بھلا اسی میں ہے کہ صاحب سے معافی مانگ لو، صاحب یقیناً تمہیں معاف کر دیں گے لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کے دوران کس طرح جواب دیتا یا نماز کیونکر بغیر کسی شرعی عذر کے توڑتا اور پھر اب تو معافی کا سوال ہی نہیں رہا جبکہ اس نے نہ صرف مجھے بلکہ سب مسلمانوں کو گالیاں دی ہیں میں پولیس کی ملازمت نہیں کروں گا محنت مزدوری کر لوں گا وہ اس سے بہتر ہے۔ عالم خان سرکاری وردی اتار کر آزاد ہو گیا مگر اس کے دل میں بار بار یہی خیال آتا کہ اگر صرف مجھے گالی دیتا تو میں خاموش ہو جاتا اس نے سب مسلمانوں کو گالیاں دیں اور دوسرے بے غیرت مسلمان خاموش رہے ہم کس قدر بے غیرت ہو چکے ہیں! انہی خیالات میں غلطاں شام تک سوچتا رہا اور پھر معاً اس کی سوچ کے دھارے ایک نکتہ پر مرتکز ہو گئے وہ نکتہ تھا انتقام، عالم خان نے کستی اٹھائی اس کی دھار دیکھی وہ کند تھی۔ کستی لے کر وہ نہر برانچ کے پل پر پہنچا۔ کستی کی دھار کو سیمنٹ کے بنے ہوئے پل پر تیز کیا وہ اس قدر تیز اور مہلک ہو گئی کہ اس نے اس سے اپنی پنڈلی کے بال مونڈے۔ دھار بنا کر وہ واپس لوٹا۔ سب لوگ آرام کر رہے تھے۔ سنتری پہرہ پر تھا کسی جگہ سرگوشی اور کھسر پھسر نہ تھی۔ عالم خان ننگے پاؤں آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر این ٹی ڈاٹن کے خیمہ کے عقب میں پہنچا۔ سنتری دوسری

سمت پہرہ دے رہا تھا۔ عالم خان گھٹنوں کے بل خیمہ کے نیچے سے اندر داخل ہوا۔ چراغ کی ہلکی ہلکی روشنی موجود تھی اور این ٹی رائن مزے کی نیند سو رہا تھا۔

عالم خان نے جو خود مضبوط جسم کا مالک تھا سیدھا کھڑا ہو گیا اور کرسی کا ایک ایسا شدید وار کیا کہ رائن کی گردن کٹ گئی اور سر اچھل کر دور جا گرا۔ رائن کے منہ سے کوئی چیخ بھی نہ نکلی۔ عالم خان فوراً دبے پاؤں باہر نکلا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر پہنچا جو جھنگ اور لائلپور کے درمیان تھی۔ عالم خاں بآسانی بھاگ سکتا تھا اس کے دل میں کئی دفعہ خیال آیا کہ وہ بھاگ جائے لیکن پھر اس کے ضمیر نے کہا نہیں اس نے سور کو مارا ہے آدمی کو نہیں۔

عالم خان رات بھر چلتا رہا صبح سویرے جبکہ تھکان کی وجہ سے وہ چور ہو چکا تھا کرسی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر جھنگ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس نے ملازموں سے کہا کہ صاحب کو باہر بلا لائیں میں ایک ضروری کام کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ ڈپٹی کمشنر ابھی سو کر بیدار ہوا تھا وہ عالم خان شتر سوار کو جانتا تھا کئی دفعہ سفر کے دوران وہ اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا ڈپٹی کمشنر جب باہر نکلا اور عالم خان کو پریشانی کے عالم میں دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے؟

اس نے تمام واقعہ اور پس منظر بتاتے ہوئے کہا کہ میں قتل کے بعد بآسانی بھاگ سکتا تھا میں حکومت اور پولیس کو پریشان کر سکتا تھا موقع کا گواہ کوئی نہ تھا میں قتل کے بعد کیمپ میں بھی رہ سکتا تھا لیکن میں نے اس لئے ایسا نہیں کیا کہ حکومت اور پولیس اندھی ہوتی ہے وہ بے گناہوں کو پکڑتی اور ان پر ظلم روا رکھتی۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس افسران مقدمہ کو کامیاب بنانے کے لئے کسی بے گناہ پر جھوٹی شہادتیں بھگتا کر موت کے سپرد کرتے۔ اس صورت میں بھی میں مجرم ہو جاتا اب میرا ضمیر مطمئن ہے میں نے اپنے ضمیر کے مطابق کوئی جرم نہیں کیا۔ رائن نے مجھے گالیاں دیں۔ مسلمانوں کو گالیاں دیں ۔

میرے دین کا مذاق اڑایا۔ میں نے اس سوّر کے بچے کو قتل کر دیا میں خدا کی بارگاہ میں سرفراز ہو گیا ہوں۔ میں خود کو آپ کے ذریعہ قانون کے حوالہ کرتا ہوں مجھے احساس ہے اور یقین ہے کہ قانون میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا اور نہ ہی میں کسی رعایت کا متمنی ہوں مگر صرف ایک درخواست ہے کہ اس مقدمہ میں میرے گھر والوں کو پریشان نہ کیا جائے ان پر کوئی سختی نہ کی جائے۔

عالم خان نے کستی اتار کر پھینک دی۔ ڈپٹی کمشنر نے اسی وقت کوتوالی پولیس کو بلا کر عالم خان کو اس کی تحویل میں دے دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مزید رعایت یہ کی کہ عالم خان کا اقبالی بیان حق نواز خان لغاری مجسٹریٹ کے روبرو قلمبند کرا دیا تا کہ پولیس واقعات کو بدل نہ سکے۔

عالم خان گرفتار ہو گیا ادھر صبح کے وقت معمول کے مطابق جب این ٹی رائن خیمہ سے باہر نہ نکلا تو اس کے محرر نے خیمہ کے باہر دو چار اونچی آوازیں لگائیں تا کہ وہ بیدار ہو جائے یا اگر جاگ چکا ہے تو بلا لے لیکن وہاں سے خاموشی کے سوا کیا جواب ملنا تھا۔ اس اثنا میں اس کے خیمہ سے خون کی بہتی ہوئی لکیریں دیکھی گئیں جو زمین میں جذب ہو کر جم چکی تھیں۔ عملہ پولیس کی تشویش بڑھی انہوں نے خیمہ کے اندر جھانک کر دیکھا تو سر تن سے جدا پڑا تھا پولیس افسروں نے وہیں پر مقدمہ کا مضمون تیار کیا۔ عالم خان چونکہ گنتی کے وقت غیر حاضر تھا اسے مجرم بنا لیا گیا اور قتل کی وجہ یہ لکھی کہ ملزم عالم خان کے پاس جو سرکاری اونٹ تھا وہ مر گیا تھا پولیس نے اسے دوسرا اونٹ خریدنے کی اجازت دی تھی اس نے ۹۰ روپے میں ایک اونٹ خریدا مگر اس کی رسید ایک سو بیس روپے کی تیار کر کے سرکاری خزانہ سے رقم نکلوائی۔ رسالدار اجمیر سنگھ اور تھانیدار کھیم سنگھ کو مالکان اونٹ نے اصل قیمت خرید سے مطلع کر دیا تھا۔ انہوں نے عالم خان سے جواب طلب کر لیا اور این ٹی رائن نے بطور ایس پی ملزم کو سرزنش کی اور تیس روپے خزانہ سرکار میں داخل کرنے کا حکم

دیا۔ اس وجہ سے ملزم عالم خان کو رنج تھا اور اس نے سرکاری تلوار سے این ٹی رائین کو قتل کر دیا ہے۔ اس مقدمہ میں دو سنتری۔ ایک شتر سوار۔ ایک تھانیدار۔ ایک سالدار اور جس سے اونٹ خریدا گیا تھا محمد بخش ولد گاموں موہل گواہ بن گئے۔

ادھر پولیس نے مقدمہ کے کاغذات تیار کئے اور عالم خان کی گرفتاری کیلئے آدمی روانہ کئے۔ نعش جھنگ لائی گئی تو پولیس کو معلوم ہوا کہ ملزم عالم خان یہاں از خود پیش ہو کر گرفتار ہو چکا ہے اور اس کا اقبالی بیان بھی قلمبند کر لیا گیا ہے اب پولیس افسران کے لیے مقدمہ کے کاغذات کو درست کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ تاہم پولیس نے تفتیش کے دوران ملزم کے عدالتی اقبالی بیان کی روشنی میں اپنے کاغذات کی عبارت میں ترمیم کر لی۔ ایک انگریز پولیس کپتان کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہ تھا سارے پنجاب میں ہلچل مچ گئی اعلیٰ حکام اور صوبائی گورنر جھنگ پہنچے۔ مقدمہ عدالت کے سپرد ہو گیا عدالت نے ملزم سے ملاقات بند کر دی اور اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں رکھا گیا چونکہ معاملہ ایک مسلمان کانسٹیبل کا تھا ہندو۔ سکھ روٴسا اور عام لوگوں کی ہمدردیاں سرکار کے ساتھ تھیں بلکہ مسلمان روٴسا بھی عالم خان کی قانونی امداد کرنے سے قاصر رہے لیکن عوامی سطح پر مسلمانوں میں عالم خان سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

مقدمہ چلا۔ عالم خان کو سزائے موت کا حکم ملا اور مارچ ۱۹۱۲ء میں ضلع میانوالی جیل میں اُسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

رائن کے قتل کے بعد عام مسلمانوں کی ہمدردیاں عالم خان کے حق میں ہو چکی تھیں۔ لوگوں نے ڈھولے تیار کئے جو شوق سے سنے جاتے تھے۔ حکومت نے ایک حکم کے تحت ڈھولے لکھنے اور سنانے پر پابندی لگا دی۔ تاہم بڑے بوڑھے اب بھی یہ قصہ مزے لے کر سناتے ہیں۔ یہ واقعہ سوٴر کے قتل کے عنوان سے مشہور ہے۔

بیوی بنک

سنہ ۱۹۳۵ء

کسی سیانے نے انسانی فطرت کا صحیح تجزیہ کیا ہے کہ عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے اور پھر جب صنف نازک مکر و فریب کا چولا پہن لیتی ہے اس سے نہ صرف اس کا خاندان بلکہ گرد و پیش کا پورا ماحول متاثر ہو جاتا ہے۔

جھنگ مگھیانہ کے باشندے "بیوی بنک" کی داستان المناک کو ابھی اپنے ذہنوں سے محو نہیں کر سکے داستان ہذا کی ہیروئن ایک نہایت پاک باز عالم گھرانہ کی عورت تھی جس کی پاکدامنی کا شہرہ تھا لیکن جب وہ پھسلی تو نیک خاندان کی شہرت خراب کر گئی بلکہ شہر کے اور کئی خاندانوں کی شہرت کو بھی متاثر کیا۔

مولوی محمد عبداللہ نام کا ایک شخص ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم تھا اس کی بیوی عام علمی گھرانوں کی عورتوں کی طرح لڑکیوں کو قرآن مجید اور بعض مسائل کی کتابیں پڑھاتی تھی ایسی عورتوں کا محلہ کی دیگر عورتوں پر ہمیشہ نیک اثر ہوتا ہے چنانچہ مولوی محمد عبداللہ کی بیوی بھی اپنے محلہ اور آس پاس کے محلوں میں نیک بیوی مشہور تھی خدا جانے اسے کیا سوجھی اس نے "امداد باہمی" کی بنیاد پر ایک بنک بنایا محلہ اور آس پاس کی عورتوں پر اثر ڈال کر ان سے زیورات اس شرط پر حاصل کئے کہ ان کے اصل زیورات محفوظ رہیں گے اور دس فیصد منافع ہر ماہ ان کو ملتا رہے گا عورتیں ایسے معاملات میں فطرتاً لالچی ہوتی ہیں لہٰذا سینکڑوں عورتیں "بیوی" کے اس لالچ میں آ گئیں اور انہوں نے اپنے زیورات خاوند یا والدین کی اجازت

اور مرضی کے بغیر "بیوی بنک" میں جمع کرا دیئے اس طرح مولوی عبداللہ کے گھر لاکھوں روپے کا سونا پہنچ گیا جسے میاں بیوی اپنی ضرورت کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے گلاتے اور فروخت کرتے رہے جب کوئی عورت منافع کا تقاضا کرتی تو اسے ۵ روپے کی شکل میں منافع دے دیا جاتا۔ اِدھر "بیوی" کے اخراجات شاہانہ ہوتے چلے گئے ادھر منافع کی ادائیگی میں پہلے ایسا تواتر نہ رہا۔ اس دوران ایک رئیس گھرانے کی عورت نے اپنے زیورات کی واپسی کا تقاضا کیا مگر "بیوی بنک" اس کے زیورات فروخت کر چکا تھا کہاں سے آتے عورت کا تقاضا بڑھتا رہا "بیوی" لجاجت سے وقت ٹالتی رہی مگر ایک دن وہ راز فاش ہو گیا جب ایک واردات کا انکشاف ہوا تو دوسری عورتوں نے بھی زیورات کی واپسی کے لئے تقاضے شروع کر دیئے پہلے معاملہ محض محلہ داری تک محدود تھا، جب "بیوی" زیورات دینے سے ہی منکر ہو گئی تو معاملہ کی نوعیت سنگین بن گئی اور نوبت پولیس تک پہنچی چنانچہ پولیس نے "بیوی" کے خلاف مقدمہ درج کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ مولوی عبداللہ بھی گرفتار ہو گیا۔ تفتیش کے دوران شہر کے بہت سے رؤسا کی خواتین اس مقدمہ میں ملوث پائی گئیں۔ پکڑ دھکڑ سے شہر کا کوئی گوشہ خالی نہ رہا۔

پولیس نے تفتیش کے دوران جو معلومات حاصل کیں وہ کچھ اس قسم کی تھیں کہ شہر کے رئیس خوجوں کی کچھ خواتین نے بنک کی سکیم بنائی اور مولوی عبداللہ کی "بیوی" کو اس مقصد کے لئے آگے کر دیا۔

پولیس نے اٹھارہ خواتین اور چالیس دوسرے اشخاص کو گرفتار کر کے ان سے اٹھاسی ہزار روپے مالیت کے زیورات برآمد کئے۔

مقدمہ کی سماعت تین سال تک سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں جاری رہی۔

عدالت نے سات خواتین اور گیارہ دیگر اشخاص کو مختلف میعاد کی سزائیں دیں۔ مولوی عبداللہ اور اس کی بیوی بھی قید ہوئے یہاں تک کہ جیل ہی میں جاں بحق ہوئی۔

"بیوی بنک" ۱۹۲۵ء میں قائم ہوا۔ سینکڑوں متوسط گھرانے اپنے زیورات سے محروم ہو گئے۔

"بیوی بنک" کی شہرت سارے پنجاب میں پھیلی۔ اخبارات نے نمایاں خبریں شائع کیں اور پنجابی میں کئی نظمیں اس موضوع پر لکھی گئیں جو اپنے زمانہ میں بہت مقبول تھیں ان میں حکیم عین الحق حیرت مرحوم اور قاضی غلام سرور کی مطبوعہ نظمیں اب بھی کچھ لوگوں کے پاس محفوظ پڑی ہیں۔ قاضی غلام سرور کی نظم نے بڑی شہرت پائی۔ قاضی صاحب نے مقدمہ کے ملزمان کے علاوہ پولیس اور سول افسران کے راز بھی ظاہر کئے جنہوں نے رشوتیں لے کر بعض ملزمان کو مقدمہ سے بری کرایا۔ قاضی غلام سرور کی یہ نظم ضبط کر لی گئی تھی۔

مولانا ظفر علی خان مرحوم نے "زمیندار" میں ایک قطعہ سپرد قلم کیا تھا جس کی پیروڈی جناب خضر تمیمی ایڈوکیٹ نے لکھی۔



چندر بھان

سنہ ۱۹۳۰ء

وہ تصویر جسے خالق نے فرصت کے وقت بنایا۔

چندر بھان حقیقت میں چندر بھان تھی اس کا چوڑا چہرہ۔ موٹی آنکھیں گھنی پلکیں، فراخ پیشانی۔ گھنگھریالے بال جو کھلتے تو گھٹنوں تک پھیل جاتے۔ اونچی ناک۔ دائیں رخسار پر سیاہ تل۔ ایسا تل جس کے بارے میں شاعر نے کہا تھا۔

؎ بہ خالِ ہندوش بخشم سمر قند و بخارا

ایک تل کی قیمت شاعر نے سمر قند و بخارا کی حسین وادیاں تجویز کی تھیں چندر بھان جب مسکراتی تو اس کے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح کھل جاتے اور روپہلے موتیوں کی طرح دانت چمک اٹھتے اس کا حسن آبشار کی طرح تیز شبنم کی طرح خنک، پھولوں کی طرح نازک، گیتوں کی طرح مدھر تھا وہ وجدان کا مجسمہ، عشق کے غیر مرئی جذبات کا

سرچشمہ اور وفا و جفا کی شوریدہ ندیوں کا سنگم۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو اس کے حسن کا مشاہدہ کر کے سلامت لوٹی۔ کوئی دل نہ تھا جس کی دھڑکنوں میں اس کا تصور نہ ابھرا۔ کوئی زبان ایسی نہ تھی جس نے حسنِ فطرت کے اس شاہکار کو خراج نہ پیش کیا ہو۔

چندر بھان نے خدا جانے کتنوں کو گھائل کیا۔ کتنے تڑپے کتنے بے قرار ہوئے اور کتنے حسرت دیدار لئے مرگھٹ کی زینت بنے۔ چندر بھان کے چہرے قد و قامت اور تیکھے نقوش نے شاعری کو جنم دیا ایسی شاعری جس کا خمیر سوز سے ابھرتا ہے۔

چندر بھان کا نام کوشلیا تھا جھنگ صدر کے محلہ بھوانہ تھلہ کے ایک رئیس ہندو خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ یہاں کے ہندو ہر سال اپنے قومی اور مذہبی میلہ مسن پر خوب بن سنور کر جایا کرتے تھے ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا جبکہ آمد و رفت کے وسائل نہ تھے مسن جانے کے لئے دریائے چناب کو کشتیوں کے ذریعہ پار کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے قافلے یہاں سے اونٹوں کے ذریعے جاتے۔ تین دن کی رنگا رنگ بہاروں کا نظارہ کرتے بیتی یادوں کو تازہ کرتے۔ وصال کے وعدے پورے ہوتے اور نئی یادیں لئے واپس لوٹتے۔ کوشلیا بھی اپنے والدین کے ہمراہ ایک دفعہ مسن گئی۔ حسن کجاوے میں سمٹ کر بیٹھ گیا اسی اونٹ کے دوسرے کجاوے میں شیخ لاہوی کا ایک ہندو نوجوان ہیرا سنگھ بھی سوار تھا۔

کوشلیا چودہ پندرہ برس کی تھی اس کا سینہ شباب کی بلندیاں سنوار رہا تھا۔ اونٹوں کا قافلہ چاندنی رات میں چناب کے جنگل بیلے میں رواں دواں تھا اور ہیرا سنگھ کی نگاہیں کوشلیا کی نگاہوں سے متصادم تھیں، رات خاموش تھی۔ جنگل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جرس کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ کوشلیا نیند کی ماری تھکی تھکی نظروں سے حسن مردانہ پر مٹی جا رہی تھی جھنگ کا پتن آیا۔ پو پھٹنے لگی۔ شب کی سیاہی کو صبح کی شفق نے جذب کر لیا۔ کشتی تیار تھی۔ حسن و عشق دونوں سوار ہو گئے۔ چناب کی موجیں مچلتی کودتی کشتی سے ٹکرانے لگیں۔ دونوں کے دلوں میں چناب سے بھی تیز لہریں اٹھیں

سورج طلوع ہوا لیکن اس کی روشنی چندر بھان کے حسن کے سامنے ماند پڑ گئی۔ حسن و عشق نے جی بھر کر میلہ دیکھا۔ لوٹ کر آئے تو دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو چکے تھے من و تو کا فرق غائب تھا۔ پہلی ملاقات دلوں میں مستقل اضطراب و بے قراری کا پیش خیمہ بنی۔ کچھ دن دونوں کی کھلی ملاقاتیں رہیں پھر قدغن لگی تو چھپ چھپ کر غم دل کا بوجھ بانٹتے رہے بالآخر دونوں پر پہرے لگ گئے۔ کوشلیا اپنے گھر میں بلا جرم و گناہ قید کر دی گئی اور ہیرا سنگھ ہجر کی شدت کی تاب نہ لا سکا وہ دل بے قرار کی تسلی کے لئے گلی گلی گھومتا کوچہ کوچہ میں اپنے پیار کا مرکز تلاش کرتا لیکن کوشلیا کے مشبھ اور سندر چہرہ کے درشن نہ پا سکا اس کی دماغی کیفیات میں جوار بھاٹا اٹھی اس کے دل سے جوالا مکھی پھوٹا۔ دیوانہ اور پاگل کہلانے لگا۔ ہیرا سنگھ جذب و مستی کے وجدان میں گھر گیا اور ہجر یار نے اسے زبان شاعری عطا کی وہ بازار میں گھومتا مگر تصور یار میں شعر پڑھتا۔ لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے وہ اس کی مترنم آواز میں پنجابی بیت سنتے۔

ہیرا سنگھ کو اس عشق نے عرفان شاعری سے آشنا کر دیا اس کا ایک بیت جس میں وہ کوشلیا کو خطاب کرتا ہے ملاحظہ کریں کتنی اٹھان ہے ؎

حسن دا کھڑیا باغ تیرا ویکھن آئی سی کل خدائی تینوں!
بوہے آئے سوالی نوں جھڑکنی ایں بے شرمے شرم نہ آئی تینوں
منہ گل نہ کریں کسے نال ہس کے جاندی حسن والی رتی چاہی تینوں
ہیرا سنگھ نوں نت ترساوی ایں نہیں گل چنگی کوشلیا بائی تینوں

"یعنی تمہارے حسن کا باغ نکھار اور بہار پر ہے جسے مخلوق خدا دیکھنے کو آ رہی ہے مگر جب وہ تمہارے دروازے پر سوالی بن کر آتی ہے تو تو بے شرم ہو کر ان کو جھڑک دیتی ہے منہ سے ہنس کر بات نہیں کرتی ابھی تو قدرت نے تجھے حسن میں سے صرف ایک رتی حسن دیا ہے اور تو اسی پر مغرور ہے ہیرا سنگھ کو ترسا رہی ہے مگر کوشلیا یہ بات تمہارے لئے اچھی نہیں"

جب ہیرا سنگھ اور کوشلیا کا عشق زبان لے کر اڑا اور گلی کوچوں میں پھیلا تو کوشلیا کے والدین نے ہیرا سنگھ کے رشتہ داروں اور محلہ داروں تک گلہ پہنچایا اور ان سے درخواست کی کہ ہیرا سنگھ اگر کوشلیا کی محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتا تو کم از کم ہماری عزت کی خاطر کوشلیا کے ناموس کی خاطر وہ اپنی شاعری میں اس کا نام نہ استعمال کرے اس طرح ہمارا خاندان بدنام ہو رہا ہے۔

ہیرا سنگھ نے کوشلیا کے ناموس کی خاطر اس کا نام لینا چھوڑ دیا اور اسے چندر بھان کے نام سے مخاطب کرنے لگا حالانکہ چندر بھان مردوں کا نام تھا۔ ہیرا سنگھ کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ اس کی کوشلیا دوسروں کیلئے موضوع گفتگو بنے

نام کی اس تبدیلی کے بعد ہیرا سنگھ کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا جسے عشق کی انتہائی منزل کہا جا سکتا ہے۔

ہیرا سنگھ کے والدین نے چندر بھان کا رشتہ طلب کیا تاکہ دونوں کی دلی خواہش پوری کی جا سکے اور دونوں خاندان مزید بدنامی سے بچ جائیں مگر چندر بھان کے والدین نے ان کی طلب اور درخواست کو قبول نہ کیا کیونکہ دونوں خاندانوں میں ہندوؤں کی قدیم رسم کے مطابق رشتہ نہ ہو سکتا تھا۔ ہیرا سنگھ اور چندر بھان کا وصال نہ ہو سکا خاندانی روایات مانع ہوئیں۔ دو دلوں کے درمیان سماج نے ناقابل عبور پہاڑ حائل کر دیئے۔ ادھر ہیرا سنگھ نے اپنی زندگی عشق کے لئے قربان کر دی۔ دوسری طرف چندر بھان کی بیقراریوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ہیرا سنگھ نے معمول بنا لیا کہ وہ محلہ بھبھرانہ کے سرکلر روڈ پر کھلے کھیتوں میں بیٹھ جاتا اور چندر بھان کے قیدی حسن کے گیت بلند آواز سے الاپتا ادھر چندر بھان اس کی آواز سن کر مکان کی بالائی منزل پر چڑھ جاتی ہیرا سنگھ کے درشن کرتی۔ ہجر و فراق کے شعر سنتی۔ روتی سسکتی اور آہیں بھرتی۔ رات رات بھر دونوں اپنے عشق کی پھلواری کو آنسوؤں کا پانی پلاتے۔ پو پھوٹتی تو ہیرا سنگھ گھر لوٹ جاتا۔ چندر بھان کے والدین کو

یہ بات بھی پسند نہ تھی انہوں نے اسے سمجھایا سختی بھی کی اور نرمی سے بھی ہیرا سنگھ کو بھول جانے کی التجائیں کیں مگر وہ عشق کے سرپٹ گھوڑے پر سوار تھی اس کا حسن ہیرا سنگھ کے تصوّر میں گھل گھل کر ہڈیوں کا ناسور بن چکا تھا اس کی رگ رگ میں خون کی طرح ہیرا سنگھ گردش کر رہا تھا۔ بالآخر ناکام ہو کر والدین نے چندر بھان کا رشتہ کسی دوسری جگہ طے کر دیا وہ چیختی چلاتی رہی اس نے باپ کے چرن چھوئے اس نے ماں کی ممتا کو پکارا اس نے بھائیوں کے پیار کو آواز دی لیکن وہاں چپ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ چندر بھان کو زبردستی ڈولی میں بٹھا دیا گیا اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ڈولی سے چھلانگ لگا کر بھاگ جائے لیکن اس پر اتنا سخت پہرہ لگایا گیا کہ وہ تازہ ہوا سے بھی محروم ہو گئی چندر بھان کی اسی قید اور بے قراریوں کو ہیرا سنگھ نے اس طرح نظم کیا۔

رات کالی تاتنگ یار والی سخن یار دا بدن وچ تیر کھڑکے
اک در بند دوجا دربان دشمن ٹراں تیز تاں پیریں زنجیر کھڑکے
سُتا ویکھ دربان نوں در کھولاں ڈرتے در بے پیر کھڑکے
ہیریا جینوں مرض ہے عشق والی سنے ہڈیاں سارا سریر کھڑکے

"یعنی رات کالی ہے اور یار سے کئے ہوئے وعدے بدن میں تیر کی طرح لگ رہے ہیں ادھر دروازہ بند ہے باہر والا پہریدار بھی دشمن ہے اگر اٹھ کر تیز چلے تو پاؤں میں پڑے ہوئے زیور پازیب زنجیر کی طرح بولتے ہیں اگر دربان اور پہریدار کو سویا ہوا دیکھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے تو دروازہ ایسا بے مرشد ہے کہ وہ بول پڑتا ہے ہیرا سنگھ جسے عشق کی مرض لگ جاتی ہے اس کا تمام جسم ہڈیوں سمیت سلگنے لگ جاتا ہے"

ہیرا سنگھ نے اس بیت میں چندر بھان کی سسرال میں قید اور بیقراری کی کیفیت کو کتنے پیارے انداز میں پیش کیا ہے۔ بالآخر چندر بھان اپنے خاوند کو نامراد چھوڑ کر والدین کے گھر آگئی اور پھر ساری زندگی ہیرا سنگھ کی یاد میں گزار دی۔

ہیرا سنگھ اپنے عشق کی ابتدا اس طرح بیان کرتا ہے۔ کہ ؎

ک کسے نہ کھٹیا ڈٹیا عشق وچوں عاشق جتنے ہوئے جہان اُتے
شیریں ویکھ فرہاد برباد ہویا تیشہ مار موریا اپنی جان اُتے
شاہ بہرام نوں لٹ لیا حسن بانو کرن سیر گیا پرستان اُتے
ہیرا سنگھ نوں ہوش نہ رہی جگ دی جو نظر پئی چندر بھان اُتے

یعنی عشق کا سودا ایسا ہے اس میں کسی نے کچھ نہیں کمایا اس دنیا میں جتنے عاشق گزرے ان سب کا یہی حال ہوا۔ فرہاد شیریں کے غم میں تیشہ کی چوٹ سے مر گیا۔ شاہ بہرام کو حسن بانو نے لوٹ لیا یہی حال ہیرا سنگھ کا ہے اس نے جب سے چندر بھان کو دیکھا اسے جہان دنیا کی کوئی ہوش نہیں رہی فقیروں کی طرح گلی گلی بے قرار پھرتا ہے۔

ہیرا سنگھ تصور یار کے بغیر اس دنیا کی تمام دلکشیوں کو ناتمام بتاتے ہوئے کہتا ہے۔

ل لندن لاہور کشمیر کابل جموں کانگڑہ جھنگ ملتان ڈٹھا
حیدرآباد بمبئی کوٹ مٹھن سمرقند غزنی خورستان ڈٹھا
راولپنڈی اڈماس اٹک جہلم جیسن دور کلرہ گوجرخان ڈٹھا
ڈٹھا بلخ بخارا ہیرا سنگھ نے بن محبوب دے کل ویران ڈٹھا

ہیرا سنگھ نے کس صداقت اور سچائی کا اظہار کیا ہے۔ اس کی جوانی چندر بھان کے عشق میں سلگ سلگ کر گھل گئی۔ مردانہ حسن کا شاہکار ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا اور چندر بھان کے ہجر و فراق میں ایک دن ہیرا سنگھ موت کی گود میں سو گیا۔ جب اس کی ارتھی شمشان بھومی کی طرف لے جائی گئی تو چندر بھان نے ارتھی کا راستہ روک لیا وہ بے قرار و بے حجاب حسن ارتھی سے لپٹ گیا۔ ہیرا سنگھ کی ارتھی منوں آگ کے شعلوں میں جل کر راکھ ہو گئی۔

ابھی چندر بھان اس غم میں مبتلا تھی کہ پاکستان بن گیا اور وہ جھنگ سے چلی گئی خدا جانے زندہ ہے یا مر گئی مگر اس کی داستان جھنگ کی لوک کہانیوں میں محفوظ ہو گئی۔

زرک خان

ولادت ۱۹۰۲ء



زرک خان کا نام آتے ہی تصور میں ایک خطرناک قسم کے ڈاکو کی تصویر ابھرتی ہے اس ڈاکو کے حالات پر انگریزی میں کئی ناول موجود ہیں۔ کولمبیا فلم کارپوریشن نے اسے فلمایا اور ملک ملک اس کی تشہیر کی۔ پشتو اور اردو میں بھی فلمیں بنائی گئیں مگر مجھے افسوس ہے کہ زرک خان کے ظلم و جبر، انتقام اور وفاداری۔ عشق و محبت کے مناظر تو پیش کئے گئے لیکن اس کے خاندانی پس منظر کو نظر انداز کیا گیا۔ زرک خان پر شائع شدہ لٹریچر اور فلمی کہانیوں میں اسے صوبہ سرحد کا باشندہ ظاہر کیا گیا ہے حالانکہ اس کا نسبی و نسلی تعلق ضلع جھنگ کی تحصیل شورکوٹ میں واقع قصبہ کوٹلہ ظریف خان سے ہے۔ زرک خان کی پیدائش اسی قصبہ میں ہوئی۔ اس کا بچپن اور لڑکپن اسی قصبہ میں گزرا کیونکہ اس کی والدہ اسی قصبہ سے تعلق رکھتی تھی البتہ اس کا والد ہیبت خان ڈیرہ اسماعیل خان کا تھا۔ زرک خان کا نسبی و نسلی تعلق چونکہ جھنگ سے وابستہ ہے اس لئے اس کی کہانی بھی شامل کتاب کی گئی

زرک خان کے والد کی پہلی شادی سنہ ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ کوٹلہ ظریف خان کی ایک عورت زراں سے ہوئی لیکن اس کے بطن سے ہیبت خان کی کوئی اولاد نہ ہوئی ہیبت خان نے دوسری شادی صوبہ سرحد کے کسی خاندان میں کی دوسری بیوی کے بطن سے

اس کی لڑکی پیدا ہوئی۔ ہیبت خان اور زراں کے درمیان ناچاقی سی رہی۔ چند سال وہ اپنے میکے رہ کر پھر خاوند کے پاس چلی گئی ۱۹۰۲ء میں اس کے بطن سے زرک خاں پیدا ہوا۔ زراں نے زچگی کے ایام اپنے وطن کوٹلہ ظریف خان میں بسر کئے اس دوران زراں کو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے تیسری شادی کر لی ہے تو ان دونوں کے درمیان پھر کشیدگی پیدا ہو گئی جو بارہ برس تک قائم رہی۔ اس دوران ہیبت خان اور زراں کے درمیان تعلقات خراب رہے برادری کے لوگوں نے میاں بیوی کو منانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اس تمام عرصہ میں زرک خاں اپنی ماں کے پاس رہا جب اس کی عمر سولہ سال ہوئی تو ہیبت خان اور زراں کے درمیان صلح ہو گئی۔ زراں اپنے بیٹے کو لے کر خاوند کے پاس چلی آئی، اب تین سوکنیں تھیں۔ ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ ہیبت خان نے ایک کشمیری النسل لڑکی جو نہایت ہی خوبصورت تھی کو تین ہزار روپے میں خرید کیا اور اپنے حرم کی زینت بنا لیا گویا اب اس کی چار بیویاں ہو گئیں۔ کشمیری دوشیزہ کی عمر ۱۷ برس کے قریب تھی اور زرک خاں بیس برس کا وجیہہ نوجوان تھا۔ زرک خان اپنی سوتیلی ماں یعنی کشمیری دوشیزہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ پہلے دونوں کے درمیان آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوئیں پھر چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہونے لگیں بالآخر ایک روز دونوں نے ہیبت خان کے خفیہ خزانہ سے نقدی۔ اسلحہ۔ زیورات وغیرہ چرا لیے اور اسی کی کار میں بیٹھ کر افغانستان کی طرف بھاگ نکلے لیکن اتفاق سے ان کی کار راستہ میں خراب ہو گئی وہ ابھی کار درست کرا رہے تھے کہ ہیبت خان مسلح ساتھیوں کے ہمراہ تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اس نے پہلی گولی اپنی کشمیری دوشیزہ بیوی کے سینہ میں ماری اور اسے موت کے حوالہ کر دیا پھر زرک خان کو بری طرح پیٹا۔ خنجر سے اس کی ناک کاٹ ڈالی۔ وجیہہ نوجوان کا خوبصورت چہرہ داغدار ہو گیا۔ ہیبت خان اپنی طرف سے زرک خان کو مار کر وہاں سے چلا گیا۔ زرک خان زخموں سے نڈھال پڑا تھا کہ ایک تاجر اسے اٹھا

کر لے گیا جہاں وہ کئی ماہ کے بعد صحت یاب ہوا اور بعد میں پہاڑوں کی گھاٹیوں میں باغیوں کی چھاپہ مار تنظیم میں شامل ہوگیا جو اس زمانہ میں انگریزوں کے خلاف بر سر پیکار تھی۔ یہاں اس نے نشانہ بازی۔ گھوڑ دوڑ۔ پولو وغیرہ کی تربیت حاصل کی پھر کیڈٹ کالج دہلی سے اعزازی ڈگری لی واپس آکر وہ قبائلی ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہوگیا جس کا کام انگریزوں کی ڈاک لوٹنا تھا یہ گروہ اتنا منظم تھا کہ برطانوی فوج اس کے مقابلہ سے عاجز تھی۔ زرک خان جسم وقامت کے لحاظ سے نہایت وجیہہ تھا مگر نفسیاتی طور پر وہ آئینہ دیکھنا پسند نہ کرتا تھا کیونکہ کٹی ہوئی ناک سے اسے شدید نفرت تھی۔ یہی اس کی بڑی کمزوری تھی۔ ایک دفعہ ڈاکوؤں کے سردار نے اس کی ناک کے بارے میں طنز کی وہ غضبناک ہو گیا اور اس نے پچاس من وزنی چٹان لڑھکا کر اس سردار کا خاتمہ کردیا۔

زرک خاں نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کے کیمپ میں آئینہ نہ رکھا جائے۔ وہ ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار بن گیا۔ دس ہزار آدمی اس کے ماتحت تھے۔ اس نے اصلاحات نافذ کیں جن کے مطابق ڈکیتی کا سارا مال اس کے سامنے لایا جاتا اس میں سے ایک حصہ ان غربا میں تقسیم کیا جاتا جن کے علاقہ سے سامان لوٹا جاتا۔ ایک حصہ زرک خان کا ہوتا اور باقی نصف اس کے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔

زرک خان نے حکم دیا تھا کہ کسی مسلمان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے صرف ہندو۔ سکھ اور انگریز کو لوٹا جائے۔ لوٹ مار میں جو ہندو عورتیں لائی جاتیں پہلے ان کو مسلمان بنایا جاتا پھر خوبصورت عورتیں زرک خان کے حرم میں پہنچا دی جاتیں باقی عورتیں دیگر ڈاکو اپنی تحویل میں لاتے۔

زرک خاں کے حرم میں پچاس سے زائد مختلف نسل ورنگ کی حسین وجمیل عورتیں ہر وقت رہتی تھیں۔ اس کا محل پہاڑیوں کے پیچ در پیچ راستوں سے گزرنے کے بعد آتا جو زمین دوز تھا اور اسی محل میں خزانہ وہتھیار رکھے جاتے تھے۔

زرک خاں کی دہشت پسند پارٹی کی سرگرمیوں سے تنگ آکر برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ جو شخص اس کا سر کاٹ کر لائے گا اسے پچیس ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں برطانوی فوج نے زرک خان کی دہشت پسند پارٹی کا محاصرہ کر لیا لیکن محاصرہ کے باوجود اس فوج کو پہاڑوں کے اندر گھسنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ محاصرہ کے دوران زرک خان نے اچانک ایک سرحدی چوکی پر زبردست حملہ کیا جس میں وہ کامیاب ہوگیا اس نے بارہ برطانوی افسر زندہ گرفتار کر کے رائفلوں سمیت ان کو پہاڑ پر لٹکا دیا اور اعلان کر دیا کہ یہ افسر بطور یرغمال رکھے گئے ہیں۔

دوسرے دن مسلح برطانوی فوج اس علاقہ میں داخل ہوئی۔ زرک خان نے ان لٹکے ہوئے انگریزوں کی کلائیاں کاٹ کر نیچے پھینک دیں وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے خود پہاڑی تہ خانوں میں چلا گیا۔

برطانوی فوج نے اس علاقہ پر شدید بمباری کی جس کی وجہ سے اس کا ہیڈ کوارٹر تباہ ہوگیا۔ اس کے ساتھی افغانستان کی طرف بھاگ گئے تاہم زرک خان نے حوصلہ نہ ہارا۔ اس نے ایک بڑی سکیم تیار کی جس کے تحت اس نے قصبہ مرغا قنبرئی پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اسی جگہ برطانوی فوج کا خزانہ اور اسلحہ موجود تھا۔

زرک خان نے بعض افغان باشندوں کو ساتھ ملایا لیکن ان ہی میں سے کسی مخبر نے برطانوی حکومت کو باخبر کر دیا اور برطانوی فوج مقابلہ کے لئے قصبہ کے اردگرد پھیل گئی۔ زرک خان کو بھی مخبری کا علم ہوگیا تھا مگر اس کے باوجود اس نے فورٹ منڈ مین کے راستہ سے مرغا قنبرئی پر حملہ کر دیا برطانوی فوج شکست کھا گئی اس حملہ میں تین سو افغانی ہلاک ہوئے مگر زرک خان نے قصبہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں کے خزانہ سے اسے دو لاکھ پونڈ ملے۔ اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر دوسری جگہ بنا لیا اور نئی فوج

بھرتی کی۔ فتحیابی نے اسے مغرور اور متکبر بنا دیا یہاں تک کہ وہ اپنے ہی ساتھیوں کو معمولی معمولی بات پر قتل کر دیتا بلکہ اس نے قصبہ کے امام مسجد کو محض اس بنا پر قتل کر دیا کہ اس نے اذان ایسے وقت دی جبکہ وہ آرام سے سو رہا تھا۔ امام مسجد کے قتل کے واقعہ نے اس کے ساتھیوں کو اس سے متنفر کر دیا اور وہ آہستہ آہستہ اسے چھوڑ کر چلے گئے یہاں تک کہ وہ تنہا رہ گیا اس کا خزانہ خالی ہو گیا حرم اجڑ گیا اور محل ویران ہو گیا۔ تنہائی اور پشیمانی نے اسے باپ سے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا چنانچہ زرک خاں مایوس ہو کر اپنے باپ کے گھر جا پہنچا۔ باپ سے معافی مانگی اور آئندہ زندگی اس کا وفادار رہنے کا عہد کیا۔ باپ نے پناہ دے دی۔ چند ماہ ہی گزرے تھے کہ برطانوی فوج نے مخبری کی بنا پر چھاپہ مارا اور زرک خان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا مگر برطانوی حکومت نے کوئی سزا دینے کے بجائے اسے کہا کہ وہ ہماری فوج میں شامل ہو کر جرمنی اور جاپانی فوج سے لڑنے کے لئے تیار ہو تو اس کے سابقہ جرائم معاف کئے جا سکتے ہیں اور فوج میں اُسے اعلیٰ فوجی عہدہ دیا جائے گا۔

زرک خان نے کچھ وقت سوچنے کے لئے طلب کیا چند روز بعد اس نے برطانوی فوج میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ سنہ ۱۹۴۱ء کا سال تھا جبکہ دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی چنانچہ زرک خاں نے پہلے دو سال افغان سرحدوں پر باغیوں کے خفیہ مقامات کی نشاندہی اور باغیوں کی سرکوبی میں صرف کئے۔ کم و بیش چھ ہزار افغان سپاہی جو برطانوی حکومت کے خلاف جرمنی کی شہ پر برسرپیکار تھے۔ اس کی وجہ سے برطانوی فوج کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

اس کے بعد زرک خان کو برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے مقرر کیا گیا۔

اپریل سنہ ۱۹۴۳ء میں وہ اپنی کمپنی میں تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ اس کے چند ساتھی

جاپانی فوج کے قبضہ میں آچکے ہیں چنانچہ وہ فوراً مسلح ہو کر جنگل کے اس مقام پر پہنچا اس نے دیکھا کہ جاپانی فوج کے سپاہی اس کے ساتھیوں کو رسیوں سے باندھ کر نشانہ بنا رہے ہیں اس نے چھپ کر فائرنگ شروع کر دی جس سے کئی جاپانی زخمی ہوئے اور مرے۔ اچانک جاپانیوں نے اس کے عقب سے حملہ کر دیا۔ گولی لگنے سے زرک خان زخمی ہو کر گرا۔ اس دوران اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جب جاپانی کمانڈر نے کہا کہ اس کا سر کاٹ دیا جائے تو زرک خان نے جواب دیا۔ ایسی آسان موت ایک بہادر کے شان کے منافی ہے۔ جس پر کمانڈر نے پہلا حکم منسوخ کر دیا اور کہا کہ اسے آہستہ آہستہ سنگینوں سے مارا جائے۔ چنانچہ زرک خان کے جسم میں سنگینیں پیوست کی جاتیں اور خون آلود نکالی جاتیں۔ آہنی بکل مار کر اس کے چہرہ کا گوشت ادھیڑ دیا اور اس کی آنکھیں سنگینوں سے ضائع کر دی گئیں اس طرح تڑپا تڑپا کر مارا کر اس کی جان اٹھارہ گھنٹے کے بعد نکلی۔ اس کی قبر برما کے فوجی قبرستان میں موجود ہے جس پر یہ تحریر کندہ ہے۔

"وفاداری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ زرک خان نے دوستوں کی خاطر جان دے دی"

زرک خان کے یہ حالات اب تک کسی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہالی وڈ وغیرہ میں اس کی زندگی پر جو فلمیں بنائی ہیں وہ نامکمل سوانح پر مشتمل ہیں یہ حالات میں نے زرک خان کے بھائی صبا خان سے حاصل کئے ہیں جو اب تک زندہ ہے اور لاہور کے ایک فلم سٹوڈیو میں ملازم ہے۔

نورنگ



ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ عورت جب انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اس کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت اور قوت مزاحم نہیں ہو سکتی۔ عورت اپنے شکار تک پہنچ کر اس پر ایسا جھپٹا مارتی ہے کہ اس کے چنگل سے انسان تو کیا خونخوار درندے بھی نہیں بچ سکتے۔ مرد کی نسبت عورت میں انتقامی جذبہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کے سامنے انتقام کے بھی کئی طریقے ہوتے ہیں۔

عورت کا انتقام تاریخ انسانیت کا ایک مستقل عنوان ہے اور ماہرین نفسیات نے اس ضمن میں عورت کی خفتہ و خوابیدہ صلاحیتوں، قوتوں اور ندرتوں کی تفصیلات بتائی ہیں۔ عورت کا پیار بھی انتہائی اور اس کی دشمنی بھی انتہائی، یعنی انسانیت کی یہ صنف ہر پہلو سے انتہا پسند تصور ہوتی ہے۔ اسی قسم کے ایک انتقام کا واقعہ جھنگ کی لوک کہانیوں میں شامل ہے اور ڈھولوں کے ذریعے زبان زد عام ہے۔

پنجابی ڈھولوں میں "نورنگ" کی بہادری اور شجاعت ایک سمبل کی حیثیت رکھتی ہے یہ "نورنگ" ہی تھا جس نے کھیوہ خان سے مرزا کے قتل کا انتقام لیا اور اس

انتقام کی اصل محرک اس کی سوتیلی ماں تھی جس نے اپنے خاوند کا بدلہ لینے کے لئے معصوم لڑکے کو جوان ہونے تک حوصلہ کیا اس کا خاوند مرزا کے قتل کے بعد ساہیوں اور ماہنی سیالوں کے درمیان ہونے والی دشمنی و عداوت کے مستقل واقعات کے دوران قتل ہوا تھا۔ مرزا صاحباں کے واقعہ قتل کے بعد راوی کی ساہی قوم اور کھیوہ کے ماہنی سیالوں میں مستقل دشمنی و عداوت کی طرح پڑ چکی تھی۔ دونوں قوموں کے بہادر ہر دو چار سال کے بعد ایک دوسرے پر شب خون مارتے اور قتل و خون ریزی کر کے واپس لوٹ جاتے۔ دشمنی کا سلسلہ نسلوں تک ان کے درمیان جاری رہا ممکن ہے آج بھی ساہی اور ماہنی سیال خاص طور پر کھیوہ خان کی اولاد یا نسل ایک دوسرے کو پسند نہ کرتے ہوں مگر حالات کے ساتھ ساتھ جیسے محبت و پیار کے انداز بدل گئے اسی طرح دشمنی و عداوت کے طریقوں میں بھی تبدیلی آ گئی۔

ساندل بار کی حوصلہ مند متحمل مزاج۔ جہاندیدہ مگر منتقمانہ ذہنیت کی مالک اس عورت کا نام ستی تھا جس کی دماغی منصوبہ بندی نے انتقام کی تاریخ میں ایک نیا عنوان قائم کیا اور چناب و راوی کے دریلیج دو آبہ میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا دیا ستی ساہی قوم کے ایک شخص مراد کی بیوی تھی مراد اپنے علاقہ کا نامور بہادر تھا اس کی دو بیویاں تھیں پہلی بیوی سے ایک لڑکا نورنگ تھا دوسری بیوی ستی سے دو لڑکے بیگ اور جسو تھے تقریباً تینوں لڑکے یکساں عمر کے تھے جبکہ مراد نے ساہیوں کے ہمراہ کھیوہ خان کے پوتے اور ریاست کھیوہ کے حکمران پر شب خون مارا۔ اس وقت کھیوہ کا حاکم فتوحل خان تھا۔ مراد ساہی نے تیز رفتار گھوڑیوں پر سوار اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کھیوہ پر حملہ کر دیا یہ حملہ اس قدر زوردار تھا کہ فتوحل خان کا ایک لڑکا بھی اس کی زد میں آ کر قتل ہو گیا۔ کھیوہ کے باشندوں نے مزاحمت کی مگر حملہ آور پوری طرح مسلح اور منظم تھے انہوں نے کھیوہ شہر میں لوٹ مار کی اس

طرح عام لوگوں کو بھی اپنا مخالف بنالیا۔ کامیاب حملہ وخونریزی کے بعد مراد واپس چلا گیا۔ ساہیوں نے مراد کی اس کامیابی پر بہت خوشیاں کیں۔ جشن منایا اور کئی روز تک اپنی فتح کا پرمسرت اظہار کرتے رہے۔

فتو حل خان اپنی شکست کا بدلہ لینے کی تیاریوں میں مصروف تھا لیکن موت نے اسے بدلہ لینے کی مہلت نہ دی اور وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوگیا۔ کھیوہ پر اس کا لڑکا صاحب خان حکمران ہوا اس نے اپنے باپ کی شکست کا انتقام لینے کے لئے مزید جنگی تیاریاں کیں۔ آٹھ ہزار مسلح ماہنی نوجوانوں کو جن میں سے کچھ کے پاس بندوقیں تھیں اس مہم کے لئے تیار کیا۔ اکتوبر ۱۷۴۸ء کی ایک چاندنی رات کو جھنگ کے ان سواروں نے مختلف ٹولیاں بناکر مراد ساہی کے علاقہ فتح آباد اور دانا آباد پر اس زور سے حملہ کیا کہ ساہی سنبھل نہ سکے۔ دانا آباد کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ مراد کو قتل کرکے اس کی لاش اپنے ہمراہ کھیوہ لائے اور مراد کی ایک بیوی کو قتل کردیا دوسری بیوی ستی اور اس کے تین لڑکوں کو گرفتار کرکے کھیوہ کے قیدخانہ میں ڈال دیا۔

مراد ساہی کا قتل بہت بڑا واقع تھا۔ مراد ان کا نہ صرف رئیس تھا بلکہ اس قوم کے لئے ڈھال کی حیثیت رکھتا تھا۔ مراد کے بعد ان میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ماہنیوں سے انتقام لے سکتا۔ مراد کے قتل کے بعد ساہی ذہنی واعصابی طور پر خود کو شکست خوردہ سمجھنے لگے تھے ان حالات میں ساہیوں نے ماہنیوں کے پاس صلح کے لئے ایک وفد بطور میلہ بھیجا اس وفد نے مراد کی لاش حاصل کی اور گرفتار شدگان کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

صاحب خان نے مراد کی بیوہ ستی کو رہا کردیا اور اس کے سر پر دوپٹہ رکھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اب صاحب خان کی منہ بولی بہن بن چکی ہے۔ ستی نے صاحب خان

سے کہا کہ مراد کے تینوں نوعمر لڑکے رہا کر دیئے جائیں لیکن صاحب خان کے دل میں یہ بات بُری طرح کھٹک رہی تھی کہ اگر ان تینوں میں سے کوئی بھی زندہ رہا تو وہ جوان ہو کر اپنے باپ کا بدلہ لے گا وہ ان لڑکوں کو رہا کرنے پر آمادہ نہ تھا لیکن اہل وفد اور ستی کے اصرار پر صاحب خان نے کچھ وقت سوچنے کی مہلت لی۔ دوسری مرتبہ جب ستی اس کے سامنے پیش ہوئی تو صاحب خان نے کہا مراد کا قتل میرے بھائی کے قتل سے بڑا نہ تھا لیکن اس کے باوجود میں ستی کو وعدہ دیتا ہوں کہ وہ مراد کے تین لڑکوں میں سے صرف ایک لے سکتی ہے اور تینوں میں سے ایک کا انتخاب وہ خود کرے۔ ستی نے کہا کہ ساہیوں اور ماہنیوں کی دشمنی و عداوت مرزا صاحبان کے وقت سے چلی آ رہی ہے ڈیڑھ صدیاں گزر چکی ہیں اور خدا جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا میں عورت ذات اس نسلی دشمنی کو ختم نہیں کر سکتی لیکن صاحب خاں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ مراد کے تینوں لڑکوں کو اگر وہ قتل کر دے گا تو مراد کی نسل ختم ہو جائے گی مراد کا خاندان اس دنیا میں ختم ہو جائے گا دشمنی کے بھی کچھ آداب اور لوازم ہوتے ہیں، صاحب خان اول تو ان معصوم لڑکوں کو واگزار کر دے اور بالفرض تمہارا سینہ اتنا ہی تنگ ہے اور تو مجھے منہ بولی بہن بنا کر میرے سر پر دوپٹہ رکھ کر بھی میرے بچوں کا خون بہانا چاہتا ہے تو مجھے منظور ہے میں اپنے دونوں حقیقی بیٹوں بیگ اور جسو کو خدا کے سپرد کرتی ہوں میں یہی سمجھ لونگی کہ میرے بطن سے مراد کا کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا تھا مگر میری سوکن کے بیٹے کو میرے حوالہ کر دیا جائے۔

صاحب خان نے ستی کی بات سن کر حیرت کا اظہار کیا اور کہا تو عجیب عورت ہے کہ تم نے اپنے حقیقی بیٹوں میں سے کسی ایک کو طلب نہیں کیا حالانکہ وہ تمہارے خون اور گوشت کے ٹکڑے ہیں جن سے مراد کی نسل اور تمہارا نام چلتا۔ تم نے اپنی سوکن کا بیٹا مانگا ہے مجھے اس میں کوئی گہری سازش نظر آتی ہے اور خوف محسوس ہوتا ہے تاہم میں

نے چونکہ بھرے دربار میں تمہیں مراد کا ایک لڑکا واپس کرنے کا وعدہ کیا ہے اور تمہیں اختیار بھی دیا ہے کہ تم تینوں میں سے ایک اپنی پسند پرلے جا سکتی ہو مگر مجھے اتنا بتاؤ کہ تم نے بیگ اور جسو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کے بجائے نوزنگ کو کیوں چنا تمہیں اپنے خون کی نسبت سوکن کا خون کیوں بہتر نظر آیا؟

ستی نے کہا کہ اگر میں بیگ اور جسو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا چاہتی تو میری ماما کوئی بھی فیصلہ نہ کر سکتی میں ماں ہوں میں اپنے کون سے لخت جگر کو اپنے ہاتھوں قتل کراتی اور کون سے کو زندہ لے جاتی اگر میں ایسا کرنے کے قابل ہو بھی جاتی تو میری روح ساری زندگی کڑھتی رہتی اب میں نے از خود فیصلہ کر لیا کہ ایسا سمجھونگی کہ میرا کوئی بیٹا ہوا ہی نہ تھا اور پھر میرے سسرال کے لوگ مجھے طعنہ دیتے کہ اپنا اور سوکن کا بیٹا قتل کرا کے ایک بیٹے کو لے آئی ۔ نہ میری روح کو سکون ملتا نہ لوگوں کی زبانیں رکتیں اور اس طرح کم از کم میں اپنی سوکن کے روبرو تو سرخرو ہو جاؤں گی کہ میں نے اپنے لخت جگر کٹوا کر تمہارے لخت جگر کی زندگی بچائی ہے ۔

صاحب خان کے دل میں گرہ پڑ چکی تھی وہ ستی کو امتحان و آزمائش میں ڈالنا چاہتا تھا۔ ستی اپنی بصارت اور فراست کی وجہ سے اس آزمائش سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی مگر صاحب خان ہمیشہ کے لئے ایک وہم گمان اور شک میں مبتلا ہو گیا۔ صاحب خان کو یہ احساس تھا کہ بیگ اور جسو کی نسبت نوزنگ نہایت سخت مزاج کڑ دیلا اور تند خو ہے جب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خوف و ہراس محسوس کیا کرتا تھا لیکن وعدہ کے مطابق اس نے نوزنگ کو ستی کے حوالہ کر دیا ۔ بیگ اور جسو کو حاضرین دربار کے سامنے قتل کرنے کے لئے بلایا لیکن درباریوں نے اسے منع کیا کہ ایسا ظلم نہ کرو کہ ماں کے سامنے اس کے بچوں کو قتل کرو ۔ چنانچہ ستی نے صاحب خان کا دیا ہوا دوپٹہ واپس کر دیا اور کہا صاحب خان جب تم میرے بچوں کو میرے سامنے قتل کرنے کے لئے تیار ہو چکے ہو تو

میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ تمہارا دیا ہوا دوپٹہ سر پر رکھوں لیکن یاد رکھنا میں نے دو لڑکوں کا خون دیا ہے یہ رائیگاں نہ جائے گا۔

سنی اور ساہیوں کا وفد مراد کی لاش اور نورنگ کو لے کر دانا آباد آگئے۔

صاحب خان نے چند روز کے بعد سنی کے بیٹوں کی لاشیں بھجوادیں۔ سنی نے حوصلہ مندی سے اپنے بچوں کی لاشیں وصول کیں۔ پھولوں کا کفن دے کر مراد کے ساتھ ان کو بھی دفن کر دیا گیا۔ ساہیوں پر ایک المیہ گزرا۔ ایک طوفان آیا۔ انتقام کی جوار بھاٹا اٹھی لیکن مراد کے بعد اس قوم میں ایسا کوئی مرد نہ تھا جو صاحب خاں سے بدلا لیتا۔

سنی نے اپنی سوکن کے لڑکے کو پالنا شروع کیا۔ اسے اپنے ساتھ پلنگ پر سلاتی اس کے کانوں میں ایسی کہانیاں لوریوں کے انداز میں ڈالتی کہ بچپن ہی سے اس کے دل و دماغ پر ساہنیوں سے انتقام کا جذبہ استوار ہونے لگا۔ وہ جب سولہ برس کی عمر کو پہنچا تو سنی نے اسے گھوڑ سواری۔ تیراکی۔ نیزہ بازی۔ تیر اندازی کی تربیت دی۔ وہ اسے لے کر دریا کے کنارے بیٹھتی خود تیر کر اسے تیراکی سکھاتی، خود سر گھوڑوں پر سوار کر کے نورنگ کو میدان میں دوڑاتی۔

سنی نورنگ کے وجود میں ساہیوں کے وقار کا نمونہ دیکھ رہی تھی نورنگ ان فنون سے جب بہرہ مند ہو گیا تو ماں بیٹے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار دانا آباد سے ستیانہ تک ساندل بار میں سفر کرتے۔ دوڑ کا مقابلہ کرتے اس طرح نورنگ کو گھوڑ دوڑ میں اتنی مشق ہو گئی تھی کہ وہ شام ڈھلے دانا آباد سے سوار ہو کر کھیوہ پہنچتا اور کھیوہ کا چکر لگا کر نصف رات کے قریب واپس چلا آتا۔ بالآخر وہ دن بھی آپہنچا جب سنی کی آرزو تکمیل کے قریب آئی۔ مراد۔ بیگ اور جسو کے قتل کے بدلہ میں نورنگ صاحب خان کے قتل کے لئے تیار ہوا۔

ماں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے گھوڑے کی باگ تھام کر اس کا

رخ کھیوہ کی طرف موڑا ستی کو یقین تھا کہ نوزنگ کبھی ناکام نہیں آئے گا۔

نوزنگ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا ہوا میں اڑنے لگا۔ نصف رات سے قبل نوزنگ کھیوہ میں موجود تھا اس نے صاحب خان کے محل کے راستے تلاش کئے مگر جن راستوں سے وہ آگاہ تھا تمام بند تھے۔ کوئی کھڑکی دریچہ کھلا نہ تھا سخت مایوس ہوا لیکن اس نے دل سے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صاحب خان کو قتل کئے بغیر کھیوہ سے قدم ہرگز باہر نہ نکالے گا اسی کشمکش میں رات گزر گئی۔ دن طلوع ہوا لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی اُدھر لوگوں کی نظریں اجنبی نوزنگ کی طرف اٹھتیں اور نوزنگ کی نظریں صاحب خان کی متلاشی تھیں اس کے کان میں بھنک پڑی کہ وہ (صاحب خان) تالاب میں نہانے گیا ہے۔

وہ گھوڑا پکڑ کر تالاب کے قریب پہنچا اجنبی مسافر کی طرح پانی پینے کی اجازت طلب کی۔ صاحب خان کے ساتھ صرف دو خدمت گزار تھے انہوں نے اجازت دے دی۔ نوزنگ پانی پینے کے بہانے جھکا ہی تھا کہ اس نے تلوار نکال کر صاحب خان کو للکارا۔ خدمت گاروں نے مزاحمت کی مگر وہ بے ہتھیار تھے خوفزدہ ہو گئے۔ نوزنگ نے آگے بڑھ کر صاحب خان پر حملہ کر دیا مگر صاحب خان پانی میں غوطہ لگا کر بچ گیا۔

نوزنگ نے پے در پے تین چار بار حملہ کیا لیکن صاحب خان ہر بار پانی میں غوطہ لگا کر بچ جاتا۔ صاحب خان کی کوشش تھی کہ وہ کنارے پہنچ کر باہر نکلے اور بھاگ جائے مگر نوزنگ بھی ہوشیار تھا جب اس نے دیکھا کہ حملہ کارگر نہیں ہو رہا تو تالاب میں چھلانگ لگا دی اور پانی کے اندر صاحب خان پر تلوار کے پے در پے وار کئے۔

صاحب خان بری طرح گھائل ہو کر تالاب کی سطح پر بیٹھ گیا۔ نوزنگ بھیگے کپڑوں کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ گیا لیکن اب اس کے چاروں طرف ناکہ بندی ہو چکی تھی کھیوہ کے لوگ مسلح ہو کر ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ تیر، نیزے اور تلواریں اس کی

طرف بڑھ رہی تھیں مگر نورنگ نے حوصلہ مندی سے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ناکہ بندی پر مامور گھوڑوں سے اوپر چھلانگ لگا کر پار ہو گیا۔ اب ماہنیوں کے سینکڑوں گھوڑے اس کے پیچھے تھے۔ نورنگ پیچھے مڑ کر تیر اندازی کرتا ہوا گھوڑے کو بھگائے چلا گیا سینکڑوں سوار راستہ بدل بدل کر اس کے تعاقب میں گئے لیکن نورنگ دانا آباد کی حدود میں داخل ہو گیا۔ ماہنی اسے گرفتار کرنے میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے۔

نورنگ جب گھر میں داخل ہوا تو اس کی ماں مصلے پر بیٹھی خدا کی بارگاہ میں (اپنے) بیٹے کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ ستی نے نورنگ کو سینہ سے لگا کر کہا

"آج میں ساہیوں کے ہاں سرخرو ہو گئی ہوں۔ یہ آرزو میری زندگی میں ہی پوری ہو گئی"

صاحب خان انہی زخموں کی وجہ سے فوت ہو گیا اور اس کا لڑکا اللہ یار خان کھیوہ کا حکمران بنا مگر اس دن سے کھیوا کی ریاست کا زوال شروع ہو گیا تھا۔

نورنگ کی بہادری اور شجاعت اس دھرتی کے سر کی مانگ اور مانگ کا سندور ہے۔ آج بھی کسان پو پھٹے جب بیلوں کی جوڑی لے کر کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں تو ان کے قلب سے آواز اٹھتی ہے۔

کال ہی بولیندی



تحریک آزادی کشمیر کا سب سے پہلا شہید

الٰہی بخش شہید



بلا شبہ وادیٔ کشمیر جنت نظیر ہے اس کے دامن ۔ پہاڑیاں ۔ چوٹیاں ۔ غاریں ۔ کھیت ۔ کنارے ۔ ندی نالے اپنے اندر لاثانی حسن رکھتے ہیں ۔ اس کے گل بوٹوں کی ہریالی اور سرخی فطرت لم یزل کا عطیہ ہے لیکن اس وادی کے پھولوں کو سرخ رنگ انسانی خون سے بھی ملا ۔ پھولوں کی سرخی ۔ چمک ۔ خوشبو میں انسان کی غیرت نے بھی حصہ ڈالا ۔ الٰہی بخش جس کا پھول جیسا نازک جسم اسی وادی میں سنگینوں سے چھیدا گیا وہ پہلا شہید تھا جس نے اپنے خون کی قیمت دے کر کشمیر کی جدوجہد آزادی کی نیو ڈالی ۔ اس کی قربانی نے دبکے ۔ مرجھائے اور مضمحل کشمیریوں کو احساس شہریت عطا کیا اور آزادیٔ فکر کا سبق پڑھایا ۔ لاکھوں سلام اس شہید حریت پر جس نے آزادیٔ کشمیر کی تحریک اپنے خون ہڈیوں اور گوشت سے ٹھوس بنیاد پر تعمیر کی اور لاکھوں سلام اس عظیم ماں کے لئے جس نے اپنی کوکھ سے

سے اس مجاہد کو جنم دے کر دادئی چنیوٹ کا سر تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بلند کیا۔

یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے جب کشمیر کے مسلمان مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت میں تمام بنیادی۔ اخلاقی و سیاسی حقوق سے محروم تھے۔ ڈوگرہ حکومت اقتصادی طور پر تباہ حال کشمیریوں کو ڈھور ڈنگر سمجھ کر ان کا استحصال کر رہی تھی کیونکہ ہری سنگھ کے دادا نے کشمیر کا خطہ ۷۵ لاکھ روپے کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی سے خرید لیا تھا اور مہاراجہ کو اس معاہدہ کی رو سے وہ تمام حقوق مل چکے تھے جو کسی مالک کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ مہاراجہ اپنی ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کو اپنا زر خرید غلام سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کو اچھوتوں سے بھی کم تر درجہ کا شہری تصور کیا جاتا تھا ان کی مجلسی زندگی کے خدوخال استحصالی قوتوں نے مٹا دیئے تھے۔ ان حالات میں اہل کشمیر نے انگڑائی لی اور اپنے حقوق کے لئے ایک تحریک منظم کی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو ڈوگرہ فوج نے نہتے مسلمانوں کے احتجاجی جلسہ پر فائرنگ کر دی جس سے ڈوگرہ حکومت کے خلاف مزید نفرت بڑھی۔ کشمیر کے مسلمان اس وقت خود کو تحریک کا متحمل نہ پا سکے اور برطانوی ہند کے مسلمانوں سے اعانت کی اپیل کی اس اپیل پر مجلس احرار اسلام کے رہنماؤں نے لبیک کہا اور ڈوگرہ حکومت کو چیلنج کر دیا کہ اگر دو ماہ کے اندر مسلمان کشمیریوں کو بنیادی حقوق نہ دیئے گئے تو مجلس احرار ریاست کے اندر تحریک شروع کر دے گی اس چیلنج کو برطانوی حکومت اور ڈوگرہ راج نے مجذوب کی بڑ قرار دیا اور سنی ان سنی کر دی۔ اس وقت پنجاب کے نواب زادے۔ جاگیردار۔ مسلم لیگی۔ یونینسٹی اور کانگرسی سب حیران تھے کہ احرار کیا تحریک چلا سکتی ہے۔ لیکن احرار نے کلکتہ سے راس کماری تک ایک آگ لگا دی اور پچاس ہزار نوجوان سرخ لباس پہنے کفن باندھے کشمیر میں داخل ہو گئے دہلی۔ یوپی۔ بمبئی۔ بنگال۔ سندھ۔ سرحد سے دس ہزار مزید رضاکار میرپور کے محاذ پر پہنچ گئے۔ ڈوگرہ حکومت نے کوہالہ کا پل بند کر دیا مگر احرار کے مجاہدوں نے لاٹھیوں اور سنگینوں کے زخم کھا کر پل پر قبضہ کر لیا یہ اتنی زبردست تحریک تھی کہ دہلی۔ یوپی اور پنجاب کی غیر تمند

خواتین بھی محاذ پر آ پہنچیں احرار مجاہدوں کی خلاف توقع یلغار اور تحریک نے برطانوی حکومت کو شل کر دیا اور ڈوگرہ مہاراج اپنی گدی چھوڑ کر نظم و نسق وائسرائے کے سپرد کر کے دہلی چلا گیا۔ احرار مجاہدوں نے میرپور۔ کوٹلہ۔ گورداسپور اور سیالکوٹ کی طرف سے جموں پر اتنا منظم حملہ کیا کہ حکومت ان مجاہدوں کو گرفتار کرنے میں ناکام ہو گئی جیلوں کا انتظام نہ کر سکی اور قیدیوں کو خوراک نہ دے سکی۔

انہی مجاہدوں میں چنیوٹ کا غازی الٰہی بخش بھی شامل تھا جس کی عمر ۳۰ برس کی تھی وہ ایک متمول شیخ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ غازی الٰہی بخش سن بلوغ کو جب پہنچا تو ہندوستان میں تحریک خلافت چل رہی تھی یہ اس تحریک میں شامل ہو گیا۔ گرفتار ہوا۔ سزا کاٹی۔ مگر انگریز کے خلاف نفرت کا مزید سامان جیل سے خرید لایا۔ قدرت نے اسے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ الٰہی بخش پنجابی کا شاعر بھی تھا اور تحریک خلافت کے دنوں میں برصغیر کے طول و عرض میں ایک پنجابی نظم بچے بچے کی زبان پر تھی وہ اسی کی لکھی ہوئی تھی جو لوگ خلافت تحریک کے زمانہ کو سمجھتے ہیں انہیں یاد ہو گا کہ ہر جلسہ میں یہ نظم پڑھی جاتی تھی۔

؎ غازی مصطفےٰ پاشا کمال وے
تیریاں دور بلائیاں
تینوں روندے سمرنا دے لال وے
تیریاں دور بلائیاں

• نظم خاصی طویل تھی مگر مجھے صرف اس کا ایک بند یاد ہے اس نظم نے الٰہی بخش کی شہرت برصغیر میں پھیلا دی تھی۔ علی برادران کی والدہ بی اماں نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور اسے اپنے سینہ سے لگایا۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے اس مجاہد کی قربانی کو خراج پیش کیا۔ الٰہی بخش شہید۔ حضرت خواجہ قمرالدین سجادہ نشین سیال شریف اور جامع محمدی کے ناظم مولانا محمد ذاکر ایک ساتھ تحریک خلافت میں گرفتار

ہوئے تھے۔

جب مجلس احرار نے کشمیر میں تحریک چلائی تو الٰہی بخش والہانہ جذبہ کے تحت اس قافلہ میں شامل ہوا جو چنیوٹ سے کشمیر کے لئے ملک اللہ دتہ صاحب کی نگرانی میں چلا تھا۔ یہ قافلہ جب میرپور کے محاذ پر پہنچا اور رات کے وقت کشمیر کی حدود میں داخل ہوا تو ڈوگرہ فوج نے سنگینیں تان لیں۔ احرار رضا کار کب ڈرنے والے تھے فوج کے اس دستہ پر حملہ کر دیا۔ دونوں میں دست بدست لڑائی شروع ہوگئی اس میں کئی ڈوگرے زخمی ہوئے اور کچھ رضا کار بھی زخمی ہوئے۔ غازی الٰہی بخش شہید نے لڑائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرپور کی سرحد عبور کر لی اور سینہ تان کر آگے بڑھا مگر ڈوگرہ فوج کے کمانڈر دشوامتر نے اچانک حملہ کر کے سنگین اس کے جسم میں پیوست کر دی جس سے وہ لڑکھڑایا سنبھلا اور پھر گر پڑا۔ الٰہی بخش نے شدید زخمی ہونے کے باوجود اس کمانڈر پر حملہ کر دیا لیکن وہ بھاگ گیا اور الٰہی بخش اسی سرزمین پر شہید ہو گیا۔ تحریک آزادی کشمیر کا یہی پہلا شہید ہے جس کے خون سے کشمیر کی جدید تاریخ لکھی جا رہی ہے۔

الٰہی بخش کی موت نے کشمیر اور برصغیر کے مسلمانوں میں ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا۔ لوگ دیوانہ وار ریاست کی حدود میں سول نافرمانی کے لئے داخل ہوئے الٰہی بخش شہید کی میّت کا جلوس جہلم۔ گجرات۔ گوجرانوالہ۔ شیخوپورہ۔ لائلپور سے گزر کر چنیوٹ پہنچا۔ سڑک کے کنارے کوئی قصبہ یا شہر ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں نے جنازہ نہ روکا ہو اور نماز جنازہ نہ پڑھی ہو۔ چنیوٹ کا یہ عالم تھا۔ گلیاں اور بازار سنسان ہو گئے تھے۔ عورتیں اور مرد جنازہ کے استقبال کیلئے باہر سڑکوں پر آ گئے اور ہزاروں مسلمانوں نے عقیدت و محبت کے ساتھ الٰہی بخش شہید کی میّت کا جنازہ پڑھ کر اسے دفن کیا۔ اس رات بلا تخصیص ہندو مسلمان اداس تھے ان کے گھروں کے چولھے ٹھنڈے رہے یہاں تک کہ کسی شہری نے بھی کھانا نہ کھایا۔ الٰہی بخش کی شہادت۔ غیرت و حریت کی ایک داستان بن

گئی۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے زمیندار کے صفحہ اول پر نظم شائع کی جس کے صرف دو شعر مجھے یاد ہیں۔

مے کشو مژدہ یثرب کی شراب گلرنگ
ہو کے کشمیر کی بھٹی سے کشید آتی ہے
قاصد احرار کا چنیوٹ گیا خط لے کر
کاغذ سرخ پہ اس خط کی رسید آتی ہے

میاں مولا بخش خضر تمیمی ایڈووکیٹ مرحوم الٰہی بخش شہید کے ہم عصر تھے ان کی زبان ہے کہ برصغیر کے تمام مسلمان اخبارات نے ان دنوں "الٰہی بخش نمبر" شائع کئے تھے ان میں زمیندار کا نمبر بہت دقیع تھا جسے انہوں نے خود مرتب کیا تھا،

اب بھی مجلس احرار اسلام الٰہی بخش شہید کے نام سے چنیوٹ میں ہر سال کانفرنس کا اہتمام کرتی ہے۔

میاں مولا بخش خضر تمیمی نے الٰہی بخش کی شہادت پر ایک طویل نظم پنجابی میں لکھی اس کا ایک بند حافظہ میں موجود ہے۔

الٰہی بخش شہادت پا گیا
بیلہ اد ہندی ہتھاں تے آ گیا
وانگوں اوہ شیراں للکار دا
نعرے تکبیراں دے مار دا

الٰہی بخش کا ایک لڑکا شیخ محمد عمر باپ کی جگہ پر قومی تحریکوں میں حصہ لیتا رہا۔ آج کل لاہور میں کاروبار کر رہا ہے۔

شیخاتی

سنہ ۱۹۳۴ء

بظاہر یہ واقعہ ایک عورت کے اغوا اور اس کی واپسی کے گرد محیط ہے لیکن اس کی اہمیت اس لئے ہوئی کہ ایک اس واقعہ نے کئی اور واقعات کو جنم دیا۔ قانون اور قومی غیرت کے درمیان شدید تصادم نے اس کی نوعیت کو مزید سنگین بنا دیا۔ قانون اگر اپنا فیصلہ قائم رکھتا تو ہزاروں بے گناہ شہریوں کا قتل اور عزتوں کا اغوا متوقع تھا۔ ایک طرف قانون اور اس کی بالادستی کی پناہ میں ہندو قوم مسلمانوں کا سر نیچا کرنے کے لئے سرگرم عمل تھی۔ دوسری طرف غیرت ملی نے قانون کے ساتھ تصادم کی راہ اختیار کی۔ حکومت وقت پریشان تھی۔ اسمبلی کا ایوان ہندو مسلم سوال سے گونج رہا تھا۔ شہر کے گلی کوچوں میں پولیس کا مسلح پہرہ تھا۔ ہندو ملازم سرکار متحد ہو رہے تھے اور مسلمان ملازم سرکار ان کے خلاف صفیں آراستہ کر چکے تھے۔ دو قوموں کے درمیان ٹکراؤ میں مسلمان اگر قانون کی بالادستی تسلیم کر لیتے تو ان کی غیرت ملی کا جنازہ نکل جاتا۔

یہ پیچیدہ ترین مرحلہ ۱۹۳۲ء میں ضلع جھنگ کے مسلمانوں کو پیش آیا اور غالباً مسلمانوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ بلا اختلاف عقیدہ و مسلک وہ ایک ہو گئے تھے۔ یہی صورت مخالف ہندو فریق کی تھی۔ مندر و مسجد کی تفریق نے شہری معاشرہ کو بے پناہ متاثر کیا واقعہ نے اس قدر اہمیت حاصل کی کہ آج وہ ہماری لوک کہانیوں کا حصہ بن چکا ہے اور وقائع نگار اسے نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اس زمانہ میں جھنگ کے ڈپٹی کمشنر میاں امین الدین مرحوم تھے

اور پولیس کپتان جوتی لعل تھا دونوں انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے مگر دونوں قومی اعتبار سے تعصب بھی رکھتے تھے۔

جرم و گناہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے ہاں کسی مذہب و ملت۔ طبقہ یا فرقہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ مجرم کے لئے اس قسم کی سوچ بے معنی ہوتی ہے کہ دوسرا فریق جو شریک گناہ ہے اس کا دین۔ مذہب۔ فرقہ یا قومیت کیا ہے؟ کیونکہ مجرم اور گناہگار لوگ جب گناہ کی وادی میں اترتے ہیں تو ان تمام فکری پابندیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں وہ خدا اور اس کی قدرتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس قسم کی حد بندیاں ان کی ذہنی سطح سے ماورا ہوتی ہیں کیونکہ گناہ بہر طور گناہ ہے اس کے لئے کوئی بھی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جب کسی انسان پر شیطنیت غالب آتی ہے تو اس کا شخصی۔ ملی۔ سماجی مرتبہ اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی صورت اس واقعہ میں بنیادی سوال کی حیثیت رکھتی ہے۔

شیخانی خواہ ملزم کی ظاہری حیثیت سے متاثر ہوئی یا اس کی شخصی خوبیوں کی گرویدہ بنی۔ اس کی جائیداد پر اس کی نظر تھی یا محض عیاشی اس کا منتہا تھی؟ یا گھریلو مجبوریوں نے اسے اس ڈگر پر کھڑا کیا تھا بہر طور اس پر شیطنیت اس قدر غالب آگئی تھی کہ وہ شخصی وقار۔ خاندانی مرتبہ۔ ملی غیرت۔ سماجی حیثیت کی تمام حدیں پھلانگ کر ٹھاکر سنگھ کی پناہ قبول کر چکی تھی شیخانی کون تھی۔ ٹھاکر سنگھ کے پاس کیسے پہنچی؟ کن حالات نے اسے ایک مسلم معاشرہ سے نکال کر سکھ معاشرہ میں جذب ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

مسلمانوں نے شیخانی کے مقدمہ کو ہندو مسلم سوال کیوں بنایا۔ جبکہ شیخانی از خود سکھ معاشرہ کو قبول کر چکی تھی، یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب واقعات کے پس منظر سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

شیخانی، شیخانہ قوم سے تعلق رکھتی تھی اور شیخ چوہڑ کی رہنے والی تھی اس کا خاوند معمولی زمیندار تھا وہ ہنستے کھیلتے گھرانہ میں تنگی و عسرت کے باوجود بس رہی تھی اس کی ۱۰۰ ایکڑ

جوان بیٹیں جوان لڑکیوں کی موجودگی میں وہ گھریلو حالات سے دل برداشتہ ہوگئی۔ اس کا خاوند واقعہ سے چند سال قبل فوت ہوچکا تھا اور وہ اپنے خاوند کی جائیداد کی اصولاً مختار کار بھی لیکن خاندانی جھگڑوں اور گھریلو تنازعات کے باعث اراضی کی کار مختاری تو کیا اطمینان سے دو وقت کی روٹی بھی نہ لے سکی! یا ممکن ہے کسی خوابیدہ اور سربستہ خواہش کی عدم تکمیل نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ یہ بات ابھی تک راز ہے کہ وہ بھرے گھر وطن اور اپنے معاشرہ سے متنفر کیوں ہوئی۔

ایک سکھ ڈرائیور ان دنوں جھنگ سے بنگلہ دیڑھ بس لے جایا کرتا تھا رات وہیں بسر کرتا اور دوسری صبح جھنگ آتا اس دوران شیخانی کا اس سے معاشقہ ہوا۔

شیخانی جس کا نام بھاگاں تھا اپنی دو جوان و پر شباب لڑکیوں کو لے کر ایک دن گاؤں سے بھاگ نکلی۔ اس کے ورثا نے تلاش کیا۔ پولیس میں اطلاع درج کرائی لیکن دو سال گزرنے کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ ملا تو مایوس ہوگئے اور اس کے مرحوم خاوند کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ شیخانی دل برداشتہ امرتسر جا پہنچی اور ایک شخص ٹھاکر سنگھ کی پناہ لے کر اس کے گھر میں بطور داشتہ آباد ہوگئی۔ ٹھاکر سنگھ کو شیخانی کے علاوہ اس کی دو جوان لڑکیوں پر بھی مکمل قبضہ مل گیا۔

شیخانی اپنی اولاد سمیت مسلمان معاشرہ سے نکل کر سکھ معاشرہ میں جذب ہوگئی مسلمان بے خبر تھے اور سکھ مطمئن۔ وقت گزرتا گیا۔ شیخانی کی جوان لڑکیاں دیگر سکھ لڑکیوں کے ہمراہ کنوئیں سے پانی بھر لاتیں، کھیتوں میں کام کرتیں۔ دیہات کے دکھ سکھ میں شریک ہوتیں۔ ان کے لباس کی وضع قطع سکھوں ایسی تھی کوئی امتیازی خصوصیت بظاہر نہ تھی کہ جس سے ان کی پہچان ممکن ہوتی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ گاؤں کے کنوئیں پر سکھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ شیخانی کی دونوں لڑکیاں بھی ان میں شامل تھیں ان میں سے ایک نے اپنا گھڑا اٹھاتے ہوئے

لفظ "ب اللّٰہم" منہ سے نکالا۔ یہ بے ساختہ ہوا ورنہ اس لڑکی کا ارادہ اس میں شامل نہ تھا" جس پر دیگر سکھ لڑکیاں اس سے الجھ پڑیں اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ گاؤں پر ایک مسلمان مزارع اللہ دتہ اس وقت موجود تھا وہ ان کی گفتگو سن رہا تھا اس نے وہاں آکر مداخلت کی اور اس لڑکی سے پوچھا کہ تم نے "ب اللّٰہم" منہ سے کیوں کہی ؟ اس کے جواب میں لڑکی نے اپنی ماں کی ساری داستان سنائی اور بتایا کہ ماں نے ہمیں بھی ٹھاکر سنگھ کا غلام بنا دیا ہے۔

لڑکیاں چلی گئیں مگر اللہ دتہ سوچتا رہا وہ ٹھاکر سنگھ ایسے بدمعاش کا تنہا مقابلہ نہ کر سکتا تھا اس نے گاؤں کے دیگر مسلمانوں سے مشورہ کیا اور شیخانی کی اولاد کو سکھوں کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے قانونی چارہ جوئی کرنے کا فیصلہ ہوا۔

امرتسر تھانہ صدر میں اللہ دتہ نے شیخانی کے اغوا کا مقدمہ درج کرایا۔ پولیس نے اس کی نشان دہی پر چھاپہ مارا۔ شیخانی اور اس کی لڑکیاں ٹھاکر سنگھ کے مکان سے برآمد ہوئیں۔ اس کی لڑکیوں نے ٹھاکر سنگھ اور اس کے لڑکے رام سنگھ پر عصمت دری کے الزامات لگائے لیکن شیخانی نے اپنے بیان میں اپنی لڑکیوں کے بیان کی نفی کر دی قانونی طور پر مقدمہ کی نوعیت پیچیدہ ہو گئی۔ پولیس کے لئے اب سوال یہ تھا کہ وہ ان تینوں کو کس کے سپرد کرے۔ شیخانی کسی مسلمان کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی اس کی لڑکیاں ٹھاکر سنگھ کے پاس رہنے کو تیار نہ تھیں۔ چنانچہ پولیس نے شیخ عبدالعزیز ایڈووکیٹ کو اس مقصد کے لئے تیار کیا۔ لڑکیاں اس کی سپرداری میں دے دی گئیں اور شیخانی ٹھاکر سنگھ کے پاس رکھی گئی۔ مقدمہ میں قانونی پیچیدگی کے پیش نظر شیخ عبدالعزیز کی رائے یہ تھی کہ چونکہ تینوں عورتیں جھنگ سے اغوا ہوئی ہیں یا ماں کی مرضی کے تابع آئی ہیں لہٰذا مقدمہ جھنگ منتقل کرا دیا جائے تاکہ وہاں گواہ وغیرہ مل سکیں گے اور سکھ عدالتوں پر اثر انداز نہ ہوں گے چنانچہ اس مقصد کے لئے عدالت

عالیہ میں امرتسر کے مسلمانوں نے رجوع کیا اور مقدمہ جھنگ منتقل کرادیا یہ ۱۹۳۴ء
مارچ کا واقعہ ہے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر میاں امین الدین نے نصر اللہ خان سٹی
مجسٹریٹ کے پاس مقدمہ سماعت کے لئے بھجوادیا۔

ابتدائی تین چار تاریخوں پر عدالت میں مقامی مسلمانوں نے کوئی دلچسپی لی مگر
امرتسر کے سکھوں اور جھنگ کے سکھوں کے درمیان مکمل رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ سردار
جیون سنگھ جو جھنگ کا متمول اور بااثر شخص تھا، نے ٹھاکر سنگھ اور شیخانی کو اپنی
پناہ میں لے لیا۔ امرتسر سے چند مسلمان تاریخ پر آتے مگر ان کا یہاں کوئی پرسان حال
نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ جب بات پھیلی تو شیخ خدا بخش عرف بھٹ خوجہ۔ اللہ دتہ زادی
حکیم علیم الحق۔ ٹھیکیدار اللہ بخش جو شہر کے سیاسی کارکن اور مسلمانوں میں نمایاں تھے ،
سامنے آگئے اور انہوں نے شیخانی کے مسئلہ کو ہندو مسلم سوال بنا ڈالا۔ ان کی مداخلت کی
وجہ سے اب شہر میں ہر جگہ یہی مقدمہ زیر بحث رہنے لگا۔

مسلمانوں نے سکھوں کے خلاف شہر میں جلوس نکالا۔ جلسے کئے اور غیرت ملی کو
ابھارا۔ دوسری طرف سکھوں اور ہندوؤں نے حکام پر اثر ڈالنے کی کوشش کی۔ اس
وقت پولیس کپتان چونی لال تھا جس کی ہمدردیاں سکھوں سے تھیں اور ڈپٹی کمشنر امین الدین
مسلمانوں کے حق میں تھا۔ ضلع کے دو بڑے افسروں کے درمیان بھی کشیدگی پیدا ہو چکی تھی
طریقہ یہ تھا کہ ہر تاریخ پیشی پر اللہ دتہ امرتسری شیخانی کی دو لڑکیوں کو اپنی نگرانی میں لاتا
اور شیخانی ٹھاکر سنگھ کے ساتھ پیش ہوتی۔ شیخانی کا بیان ٹھاکر سنگھ کے حق میں پہلے ہی
عدالت میں ہو چکا تھا اس لئے عدالت اب اسے کسی اور کے حوالہ نہ کر سکتی تھی مگر سکھوں
نے عدالت میں شیخانی کی لڑکیوں کے بارے میں اس کی ماں سے درخواست دلوادی کہ میری
لڑکیاں میرے حوالہ کردی جائیں تاکہ میں ان کو نگرانی میں رکھ سکوں۔

عدالت نے یہ درخواست سماعت کے لئے منظور کرلی اور اگلی تاریخ ڈال دی

مسلمانوں کو شبہ تھا کہ سکھوں کی درخواست منظور ہو جائے گی اور لڑکیاں عدالتی حکم کے تحت سکھوں کے حوالہ کر دی جائیں گی۔ مسلمانوں نے شہر بھر میں فضا اپنے حق میں تیار کر لی تھی کہ اگر ایسا ہوا تو وہ ان دونوں لڑکیوں کو جبریہ اٹھا لیں گے

دوسری طرف چونی لال کپتان نے سکھوں کو یقین دلایا تھا کہ عدالت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گا۔ دونوں فریق پوری تیاری کر چکے تھے۔ تاریخ مقررہ کے روز میجر مبارک علی شاہ آف شاہ جیونہ۔ میاں حسین شاہ آف رجوعہ۔ چوہدری غلام سرور مرحوم اور دیگر مسلمان رؤسا جمع ہوئے۔ مسلمان وکلا شیخ کریم بخش۔ شیخ امین الدین۔ شیخ غلام یاسین۔ شیخ عبدالرحیم وغیرہ مسلمانوں کی طرف سے کونسل تھے اور ہندوؤں کی طرف سے چندر پرکاش لیڑا۔ رام دتہ مل کپتان۔ تخت مل چوپڑا۔ دینا ناتھ وغیرہ

شہر میں ہندو مسلم کشیدگی کی بنا پر ڈپٹی کمشنر نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی اور اسلحہ وغیرہ لانے پر پابندی لگا دی گئی مگر اس کے باوجود مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر جلوس کی صورت میں ضلع کچہری پہنچے اور احاطہ کچہری کو گھیرے میں لے لیا۔

گرد و نواح کے بلوچ۔ نول اور دیگر اقوام کے نوجوان لاٹھیاں۔ کلہاڑیاں اور نیزے لئے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کچہری میں داخل ہو گئے۔ ہندو سکھ ملازمین خوف کے مارے دفاتر تک نہ جا سکے۔ عدالتیں اور دفاتر عملاً اس روز بند رہے۔ نصراللہ مجسٹریٹ کے عدالتی کمرہ کے اردگرد مسلمانوں کا مشتعل ہجوم تھا جس کے اشتعال انگیز نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ شینخانی اور اس کی دونوں لڑکیوں کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیا جائے اور ٹھاکر سنگھ کو جیل بھیجا جائے ورنہ مسلمان طاقت استعمال کریں گے

شہر میں اس قدر خوف و ہراس پھیلا کہ ہندوؤں سکھوں نے خود کو گھروں میں قلعہ بند کر لیا۔ شہر میں ہڑتال ہو گئی۔ لٹھ بند مسلمانوں کے جتھے شہر کے مختلف حصوں سے نعرے لگاتے ہوئے ضلع کچہری جانے لگے۔ کم و بیش دس ہزار کا اجتماع تھا۔

اس دوران ایس پی چونی لال ہجوم کے سامنے آیا اور اس نے حکم دیا کہ پانچ منٹ کے اندر یہاں سے چلے جاؤ اور منتشر ہو جاؤ کیونکہ دفعہ ۱۴۴ کے تحت یہ اجتماع خلاف قانون ہے لیکن مشتعل ہجوم پر اس کی وارننگ کا کوئی اثر نہ ہوا اس نے پولیس کو حکم دیا کہ ہجوم کے گرد گھیرا ڈال لو مگر پولیس مسلح ہونے کے باوجود حوصلہ نہ پا سکی کہ وہ آگے بڑھے، چونی لال نے دوبارہ وارننگ دی کہ منتشر ہو جاؤ ورنہ گولی چلا دی جائے گی لیکن ہجوم برابر اپنی جگہ ڈٹا رہا اب چونی لال ہجوم میں گھر چکا تھا۔ لوگ کمپنی باغ میں داخل ہو کر درختوں کو کاٹ کاٹ کر نیچے پھینک رہے تھے۔ اور ڈنڈے تیار کر رہے تھے۔ جھنگ کلب کی عمارت کا سامان لوٹ لیا یہاں تک کہ پھولوں اور پودوں کے گملے باغ سے اٹھا کر سڑک پر توڑ دیئے گئے۔ چونی لال نے کوئی بدزبانی کی کہ ہجوم ایک دم اس پہ ٹوٹ پڑا، اور اس پر لاٹھیاں برسنے لگیں۔ پولیس میں بیشتر ملازم مسلمان تھے ظاہر ہے کہ انکی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں اچانک اس دوران ڈپٹی کمشنر امین الدین اپنی کوٹھی سے نعروں کی آواز سن کر ننگے پاؤں کمپنی باغ کے راستہ سے ہجوم کو چیرتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں چونی لال کھڑا تھا۔ چونی لال نے پولیس کو فائرنگ کا حکم دیا لیکن ڈپٹی کمشنر نے اسے فوراً روک لیا اور ہجوم سے کہا کہ آپ سب لوگ پیچھے ہٹ جائیں اور اپنے سرکردہ افراد کو گفتگو کے لئے میرے پاس بھیجیں چنانچہ ڈپٹی کمشنر کے حکم پر لوگوں نے ضلع کچہری کی سڑک اور سٹی مجسٹریٹ کا برآمدہ خالی کر دیا۔

وفد کی گفتگو ہوئی اس میں یہ طے پایا کہ شیخانی اور اس کی دونوں لڑکیوں کو ٹھاکر سنگھ سمیت جیل میں رکھا جائے گا اور مقدمہ کی سماعت اب جیل میں ہوگی۔ سماعت مکمل ہونے تک ان حوالاتیوں سے فریقین کے وکلا کے علاوہ کسی کو ملاقات کی اجازت نہ ہوگی۔ مسلمان اس حکم پر مطمئن ہو گئے اور مشتعل ہجوم نعرے لگاتا ہوا شہر میں داخل ہو کر منتشر ہو گیا۔ نصر اللہ خان مجسٹریٹ نے جیل کے اندر سماعت شروع کر دی۔ پندرہ

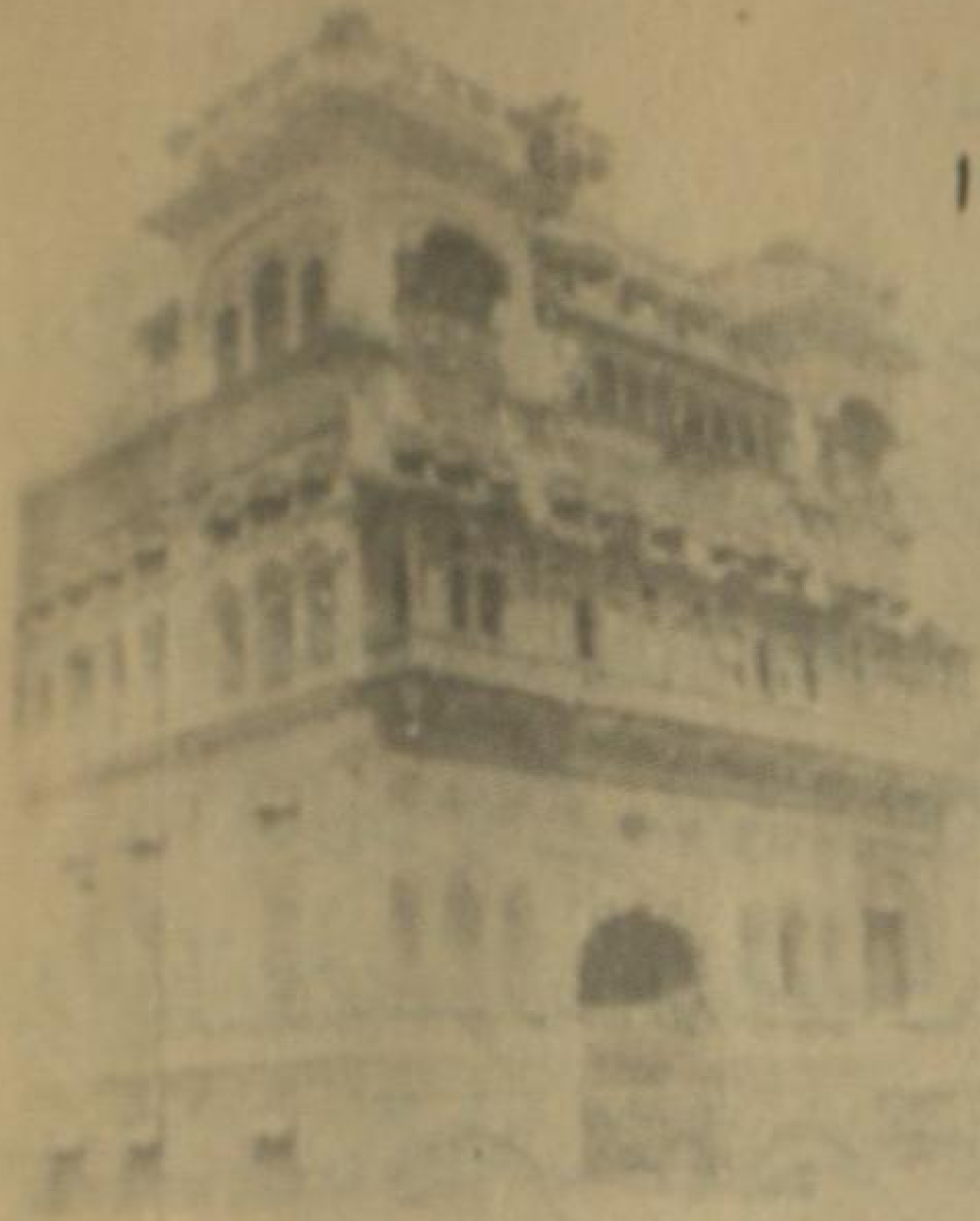
روز مسلسل سماعت جاری رہی۔ مجسٹریٹ نے شیخانی کو چھ ماہ قید اور ٹھاکر سنگھ کو ایک سال قید کا حکم دیا اور شیخانی کی دونوں لڑکیوں کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیا گیا کیونکہ مسلمان شیخانی کو پناہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

شیخانی قید ہی کے دوران جیل میں مرگئی۔ ٹھاکر سنگھ نے اپنی سزا یابی کے خلاف اپیل دائر کر دی جو مسترد کر دی گئی حکومت نے اسے جھنگ سے بہاولپور جیل منتقل کر دیا کیونکہ سکھوں نے خطرہ کے پیش نظر منتقلی کی درخواست کی تھی۔

- شیخانی گھر سے کن حالات میں بھاگی ؟
- جوان لڑکیوں کو کیوں لے گئی ؟
- ٹھاکر سنگھ کے ہاں اس نے سکھ مذہب کیوں قبول کیا ؟ ان تمام واقعات کی تفصیل مقدمہ کی مثل پر موجود ہے جسے غیر ضروری سمجھ کر یہاں درج نہیں کر رہا۔

شیخانی کا واقعہ جھنگ کی دیگر کہانیوں کی طرح مشہور ہے۔ بڑی عمر کے لوگ، مزے لے لے کر اپنی اولاد کو سناتے اور ہندوؤں سکھوں پر اپنی سیاسی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔





گلزار منزل

سنہ ١٩٣٥ء

وہ لوگ یقیناً خوش قسمت ہیں جو اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے کو اپنی آنکھوں سے بڑھتا پھلتا پھولتا دیکھیں اور جب وہ پودا تناور درخت کے روپ میں اپنی گھنی شاخوں پر آفتاب کی نوکیلی تمازت روک کر زمین پر ٹھنڈا گھنا اور میٹھا سایہ پھیلائے اور اس سایہ میں وہی لوگ آرام و استراحت کریں جنہوں نے یہ پودا لگایا تھا اگر پودا لگانے والا اسے گھنے اور تناور درخت تک پہنچنے سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو اس کے دل میں حسرت ہی رہے گی اس کی بلا سے کہ آنے والے کل کو کون اس کے سایہ میں سانس لیتا ہے اسی طرح اگر درخت اس شخص کی زندگی میں سوکھ جائے تو وہ شخص ارمانوں کا مرقد ہو گا ایسا مرقد جس پر نہ روشنی نہ سایہ

اس دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے ننھے منّے پودے کو پروان چڑھتا دیکھ کر اس کے سایہ کا لطف اٹھاتے ہیں۔

انسان اپنی زندگی میں بہت کچھ سوچتا ہے منصوبے بناتا ہے دولت و تمول کے زور سے اپنی انفرادیت کو نمایاں رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب موت کی غیر مرئی زنجیریں اس کے روح و جسم کو گرفتار کر کے ہمیشہ کے لئے شل کر دیتی ہیں تو عالم خیال میں وہ اپنے ماضی پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر بیچارگی کے باعث کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ضلع جھنگ کے مالدار اور تاریخی قصبہ چنیوٹ نے ایسے ہی ایک کربناک واقعہ اور

المناک حادثہ کو اپنے دامن میں ہمیشہ کے لئے چھپا رکھا ہے۔ اس المیہ کا عنوان چنیوٹ کا فلک بوس کاخ محل ہے جسے لوگ عمر حیات کا محل کہتے ہیں مگر محل کے صدر دروازہ پر نصب شدہ کتبہ کے مطابق یہ گلزار منزل ہے بظاہر یہ محل اینٹ گارے چونے اور ساگوان کی قیمتی لکڑی سے بنا ہوا ہے لیکن درحقیقت اس کی تعمیر میں عمر حیات کے جذبات آرزوئیں۔ خواہشات اور ارمان شامل ہیں۔ انہی ارمانوں نے ایک فلک بوس محل کو جنم دیا جو اس علاقہ میں تاج محل کی طرح مشہور ہے اور اس سے منسوب محبت کی کہانی بھی ممتاز محل بیگم کی طرح مشہور۔ منفرد اور بے مثال ہے۔

گلزار منزل ایک حادثہ اور ایک المیہ کا عنوان ہے ہر وہ شخص جو کاخ محل کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اس کی آہ دنیا کی بے ثباتی کا مظہر بن جاتی ہے اس محل اور اس کے آس پاس کی فضا اور خلا میں کتنے آنسو انسانی آنکھوں سے اچھل کر پھیلے ہوں گے کتنی آہیں زندگی کی سرسراہٹوں کو مضطرب کر چکی ہونگی ان کا احاطہ مشکل ہے اس فاصلہ اور عرصہ کو ناپا نہیں جا سکتا اس وقت و کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے۔ کیونکہ المیہ بہرحال المیہ ہوتا ہے اور اس کا احاطہ احساس کی قوتیں کر سکتی ہیں۔ زبان و قال الفاظ و تراکیب اس کے لئے قطعی بے وقعت چیزیں ہیں۔

چنیوٹ کے خوجے عموماً امیر اور دولت مند تصور ہوتے ہیں ان ہی میں ایک شخص نور بخش نام کا گزرا ہے جس کے چھ بیٹے تھے ان میں پانچ سگے اور چھٹا ان کے لئے سوتیلا تھا۔ عمر حیات جس کے نام سے محل مشہور ہے اسی نور بخش کا بیٹا تھا۔ جب جوان ہوا تو تجارت کی غرض سے کلکتہ چلا گیا یہاں اسے تجارت سے کروڑوں روپے ملے اس نے متعدد مکان اور دکانیں تعمیر کرائیں پٹرول پمپ بنایا اس کے پاس دولت کی ریل پیل تھی اور بظاہر اس کی ہر خواہش پوری ہوئی تھی قدرت نے اولاد سے بھی نوازا تھا ایک لڑکا اور ایک لڑکی اس کے وارث تھے۔ لڑکی عمر میں بڑی تھی

۱۹۱۶ء میں اسے اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکا عطا کیا جس کا نام گلزار محمد رکھا گیا یہی بچہ والدین کی امیدوں کا مرکز بنا ناز و نعم میں پلا اس کی خوراک، لباس، تعلیم۔ انداز فکر دولت مندوں کی اولاد جیسے تھے اپنے سے اونچا ان کو کوئی نظر نہ آتا اور اپنے سے نیچے دیکھنا امیرزادوں کی روایت کے ہی خلاف تھا۔

عمر حیات نے گلزار کی پیدائش کے بعد یہ ارادہ کیا کہ وہ چنیوٹ میں اپنے لڑکے کے نام پر ایک ایسا محل تعمیر کرائے گا جس کے مقابلہ کی چنیوٹ میں اور کوئی عمارت نہ ہوگی جو اس کی دولت و تمول کا اشتہار بن جائے گا اور اس کی خوجہ برادری میں انفرادیت قائم ہو جائے گی۔ ان جذبات کے تحت عمر حیات نے چنیوٹ میں محل شروع کرایا اس کے لئے ساگوان کی لکڑی برما اور سنگاپور سے خریدی ۱۹۲۱ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اس وقت پختہ اینٹ کا بھاؤ چھ روپے ہزار تھا۔ کاریگر مستری کی روزانہ اجرت دو روپے اور مزدور کا یومیہ بارہ آنے (پچھتر پیسے) تھا۔ یہ پانچ منزلہ وسیع اور خوبصورت محل آٹھ سال کے عرصہ میں مکمل ہوا اور اس کی تعمیر پر چار لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ جالندھر۔ آگرہ اور چنیوٹ کے بہترین کاریگروں نے لکڑی پر نقش و نگار تراشے۔ یہ نقش و نگار آج بھی فنی ماہرین کے لئے استاد اور اتالیق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ محل کی تعمیر مکمل ہوئی مگر عمر حیات کو اس میں رہنا نصیب نہ ہوا وہ جنت جو اس نے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے بنائی تھی خود اس سے محروم رہا اور محروم ہی دنیا سے رخصت ہو گیا

ذرا عالم تصور میں اس کیفیت کا جائزہ لیں جو عمر حیات پر موت سے قبل طاری ہوئی ہوگی۔ کروڑوں کا سرمایہ۔ لاکھوں کی جائیداد۔ چنیوٹ کا کاخ محل جو اس کی آرزوؤں کا مرکز تھا موت کی ہچکی آنے سے قبل ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں میں پھرتے رہے اور وہ عالم تصور میں سوچتا رہا کہ جس دولت و تمول کے سہارے وہ برادری میں منفرد

ہونا چاہیتا تھا وہ دولت اس کے لئے بیکار ثابت ہوئی۔ عمر حیات اس دنیا سے چلا گیا اب اس خاندان میں جس کے تین افراد باقی بچے تھے کی سربراہ عمر حیات کی بیوہ تھی اس نے عورت ہونے کے باوجود خاوند کے کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لیا پہلے اپنی لڑکی کا بیاہ خاوند کے بھتیجے سے کیا لیکن یہ لڑکی صرف دو سال بعد تپدق میں مبتلا ہوکر دنیا سے رخصت ہوگئی اس کی بیماری کا علاج کرنے کے لئے ماں نے وہ سب کچھ کیا جو اس کی ممتا کر سکتی تھی۔ مالدار والدین اپنی اولاد کے لئے قیمتی سے قیمتی علاج کرتے ہیں مگر غریب والدین اپنی اولاد کے لئے صرف شفقت ممتا اور دعاؤں سے آگے نہیں بڑھ سکتے کیونکہ ان کے وسائل یہی ہیں

۱۹۳۴ء تک عمر حیات کا محل آباد نہ ہو سکا لاکھوں روپے کے صرف سے تیار ہونے والا محل اپنے مکینوں کے لئے چشم براہ رہا۔

عمر حیات کی بیوہ نے اپنے یتیم لڑکے کو فلک بوس محل میں آباد کرنے کا اور گلزار کو کلکتہ سے چنیوٹ بلوایا اور اس کی نسبت عمر حیات کے حقیقی بھتیجے کی لڑکی سے طے کردی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی اکتوبر کا مہینہ گرمیوں کی رخصتی اور سردیوں کی آمد۔ اہل چنیوٹ کے لئے گلزار کی شادی ایک یادگار کی حیثیت رکھتی ہے ایک مالدار نوجوان جس کے پاس کروڑوں روپے کی جائیداد، مردانہ حسن اور خوبصورتی کا حامل زندگی کی نئی منزل کی طرف رواں دواں مستقبل کے سہانے خواب۔ دلہن کے حسن کا تصور زندگی کی کامرانیوں کا عروج۔ سینکڑوں ارمان ہزاروں خواہش۔ بیسیوں آرزوئیں۔ وسیع تر وسائل۔ جوانی و شباب کا خمار۔ گلزار میں وہ سب کچھ تھا جو اس قسم اور اس ماحول کے نوجوانوں میں ہونا چاہئے۔ بالآخر خوشی و مسرت کی وہ گھڑی آپہنچی جسے پانے کی طلب میں عمر حیات مایوس ہوکر اس دنیا سے جاچکا تھا جس کی حسرت دل میں سمائے گلزار کی بہن رخصت ہوگئی تھی۔ عمر حیات کے محل سے بڑے دھوم

کے ساتھ گلزار کی بارات روانہ ہوئی۔ چنیوٹ کا ہر خاندان اس تقریب میں مدعو تھا۔

دلہن کے والدین نے بساط سے بڑھ کر اپنی بیٹی کو دیا اتنا دیا کہ شاید چنیوٹ کی ہزاروں غریب بیٹیوں کا جہیز بن سکتا۔ اس قدر خرچ کیا کہ سینکڑوں نا کتخدا لڑکیوں کے سہاگ کا انتظام ہو سکتا۔ بارات گئی اور دلہن کو لے کر لوٹ آئی محل کا کونہ کونہ سجا ہوا تھا۔ دیواروں سے خوشبوؤں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ پھولوں کے ڈھیر صحن محل سے گلی تک پھیلے ہوئے تھے۔

آفتاب کی کرنیں افق مغرب میں ڈوب گئیں۔ شفق کی لہروں سے ستاروں نے جنم لیا اور نیلگوں فلک پر سیج بچھا دی رات بڑھتی گئی۔ اس کی زلفیں پھیلتی گئیں محل کے کمروں کی بتیاں گل کر دی گئیں۔ ڈھول باجے تھک کر خاموش ہو گئے چہل پہل میں ایک ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہو گیا۔

گلزار کی ماں کے لئے بیٹے کی سہاگ رات اس کے خوابیدہ ارمانوں کی تکمیل تھی چھوئی موئی کی طرح سمٹی ہوئی دلہن نے مستقبل کی دنیا میں قدم رکھ دیا تھا۔ انجانے وسوسے، اندیشے، ارادے اور مستقبل کے منصوبے اس کے چھوٹے سے دماغ میں ہلچل مچا رہے تھے دو جوان جسم ملے۔ دل دھڑکے۔ من کی باتیں زبان پر آئیں۔ مستقبل کے لئے عہد و پیمان ہوئے۔ رات بیت گئی۔ سمٹی ہوئی رونقیں لوٹ آئیں۔ چہل پہل نے پھر بری لی۔ گلزار سہاگ رات کی میل اتارنے کے لئے غسل خانہ میں نہانے گیا ادھر ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ گیتوں کی لہریں مچلیں۔ نغمات جوبن پر آئے دلہن کی سہیلیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال کر چٹکیاں لینی شروع کیں۔ دلہن کی مسکراہٹ سہیلیوں کے زوردار قہقہوں میں ڈوبنے لگی اس کا دل انجانے خوف سے دھڑک اٹھا۔ بیتی رات کی ایک ایک بات اس کے دل و دماغ میں گھومنے لگی۔

گلزار غسل خانہ میں تھا ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دو گھنٹے گزرے لیکن وہ نہا کر باہر نہ

نکلا۔ شاید تقدیر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گلزار اپنا بدن خود پاک نہ کرے بلکہ دوسرے لوگ اسے نہلائیں۔ ادھر گلزار کو سلامی دینے والے اس کے انتظار میں بیٹھے ولیمہ کی دعوت شروع ہوئی۔

گلزار کی خالہ غسل خانے کی طرف آئی وہاں گہری خاموشی اور گرم پانی کی بھاپ اور کوئلوں کا دھواں سیر سپاٹا کر رہے تھے۔ گلزار کی کوئی آواز نہ تھی۔ دروازہ کھولا گیا تو وہ غسل خانے میں چت لیٹا ہوا تھا اور اس کی روح جواں جسم کو چھوڑ کر عالم بالا کو جا چکی تھی۔ بھرا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ دلہن نے سہاگ کا جوڑا پھاڑ دیا زیور اتار کر پھینک دیئے۔ بے تاب ہو کر گلزار کی لاش پر گری جو وفا کے دعوے کرنے کے باوجود بے وفائی کر چکا تھا۔

وہ عظیم الشان محل جس پر لاکھوں روپے صرف ہوئے تھے ماتم کدہ بن گیا گلزار کو کفن دے کر اسی محل میں سپرد خاک کر دیا گیا

گلزار کی موت اہل چنیوٹ کیلئے اب تک لانحل معمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کئی کہانیاں اور کئی روائتیں ہیں کہا جاتا ہے کہ غسل خانے میں بجھے ہوئے کوئلوں کا گیس بھر چکا تھا جب وہ اندر داخل ہوا دفعتاً اس کا دم گھٹ گیا اور اس کی آواز بھی باہر نہ نکل سکی۔ یہی بات زیادہ قرین قیاس تسلیم کی جاتی ہے مگر ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس لڑکی سے گلزار کی نسبت ہوئی تھی اس لڑکی کو انہی کی برادری کا ایک اور نوجوان بھی چاہتا تھا اس نوجوان نے دوست بن کر گلزار کو زہریلا پان کھلایا جس سے اس کی موت واقع ہوئی۔

بعض لوگوں نے یہ بھی گمان کیا کہ گلزار کی دلہن نے اسے کوئی زہریلی چیز کھلائی تھی ہو سکتا ہے یہ محض کہانیاں ہوں مگر گلزار کی موت کا معمہ آج تک حل نہ ہو سکا۔ اس کی جواں سال بیوہ کا نکاح برادری کے ایک اور شخص سے کر دیا گیا اور

وہ خاوند کے ساتھ کلکتہ چلی گئی اور ابھی تک زندہ ہے مگر اولاد سے محروم ہے اس کے خاوند نے دوسری شادی کر لی۔

گلزار کی بیوہ ماں جسے دولت کے علاوہ دل کی کوئی بھی خوشی نصیب نہ ہو سکی بیٹے کے غم میں گھل گھل کر پاگل ہو گئی اور چار سال بعد فوت ہو گئی اسے بھی گلزار کی قبر کے ساتھ اسی محل میں دفن کر دیا گیا۔

عظیم الشان محل قبر دا، کا محافظ بن گیا لوگ اسے اب منحوس سمجھنے لگے ورثا نے یہ محل ایک یتیم خانہ کے لئے وقف کر دیا لیکن ایک عرصہ کے بعد یتیم خانہ و عربی مدرسہ بھی یہاں سے ختم ہو گیا کیونکہ اس کے کمرے شکستہ ہو گئے تھے تاہم عمر حیات کے ملازمین اور ان کی اولاد اب بھی اسی محل میں رہتی ہے مگر اس کی مرمت کا حوصلہ کسی کو نہ ہوا۔ گزشتہ دنوں لکڑی کے بہترین کام کی وجہ سے محکمہ آثار قدیمہ نے اسے اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن محل کے مکینوں نے مزاحمت کی۔

چنیوٹ کی یہ عمارت شاہی مسجد۔ مقبرہ شاہ برہان۔ قلعہ ریختی کی طرح سیاحوں کے لئے کشش رکھتی ہے۔

—— انسان کیا سوچتا ہے؟

—— اور قدرت کیا فیصلہ کرتی ہے؟

—— عمر حیات کا محل اس کی زندہ تصویر ہے۔

نعمت بی بی

تاریخ میں بعض ایسے واقعات مطالعہ میں آتے ہیں جن سے انسانی فکر کو حیرانی محسوس ہوتی ہے اور بادی النظر میں ان کی اصلیت و حقیقت تسلیم نہیں کی جاسکتی مگر وہ حقیقت ہی کیا جو اپنے وجود کا اعتراف نہ کرائے۔

کیا یہ بات یقین کے لائق ہے کہ ایک بہادر سالار جو فتوحات کیلئے اپنا لشکر دریا و صحرا میں دوڑاتا ہوا ہر کٹھن مرحلہ کو قبول کرے مگر ایک عورت کی گھرکی۔ جھڑکی اور تھپیڑ سے خوفزدہ ہوکر اپنا لشکر بلا مطلب براری کے واپس لے جائے۔ ایسے واقعات تاریخ کے صفحات پر مل جاتے ہیں کہ ایک جابر و قاہر حکمران یا سالار کسی عورت کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوکر اپنی مہم سے دستبردار ہوا ہو۔ یا کوئی عورت اس کے مزاج میں اس حد تک داخل ہوگئی ہو کہ اس کی رضا و منشا پر سلطنت کے فیصلے ہوتے ہوں۔ ایسا بھی ہوا ہوگا کہ ایک سالار یا حکمران کے مقابلہ میں ایک بہادر عورت میدان میں آئی ہو، اور اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس سالار یا حکمران کو شکست دی ہو لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ میدان مقابلہ و مقاتلہ کے بغیر کوئی ماہر جنگجو اور سالار لشکر کسی عورت کے خوف و دبدبہ کے پیش نظر اپنی فوجی مہم ترک کرنے پر مجبور ہوا۔ مگر یہ واقعہ سرزمین جھنگ میں ہوا اور پنجاب کی تاریخ کا ہمیشہ کے لئے عنوان بن گیا۔

پنجاب کے سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کا والد سردار مہاں سنگھ خود قابل اور جنگجو انسان تھا اس نے پنجاب کے بیشتر شہروں اور ذیلی ریاستوں میں لوٹ مار کی

طرح ڈالی۔ طوفان کی طرح پنجاب کے کونہ کونہ میں اس کی عسکری دھاک بیٹھی چھوٹے چھوٹے حکمران اس کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہ پاتے اور ہتھیار ڈال دیتے تھے اسی مہاں سنگھ کو جھنگ کی ایک جہاندیدہ اور بہادر عورت نے ایسا تھپڑ مارا کہ اسے اپنی زندگی میں دوبارہ ادھر آنے کا حوصلہ نہ ہوا البتہ اس کے بیٹے رنجیت سنگھ نے باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے جھنگ میں بے پناہ لوٹ مار کی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا تھا کہ اس شہر کے مسلمانوں سے کسی قسم کا نرم سلوک نہ کیا جائے کیونکہ یہاں کی ایک عورت نے میرے باپ کی توہین کی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ وہ کون تھی ؟ وہ بہادر خاتون نواب سلطان محمود خان کی بیوی نعمت بی بی تھی۔ نواب عنایت اللہ خاں رئیس ریاست جھنگ کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی سے سلطان محمود خان تھا جو اس کا جانشین بنا اور دوسری داشتہ طوائف تھی جس سے صاحب خان تھا۔ عنایت اللہ خان ۱۵ صفر ۱۲۰۲ھ کو فوت ہوا اور اس کی جگہ سلطان محمود خان ریاست کا حکمران بنا۔

صاحب خان اور سلطان محمود خان کے درمیان اقتدار حکومت کے لئے ابتدا میں ہی چپقلش شروع ہو گئی جس نے بڑھتے بڑھتے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ دونوں کے درمیان کئی بار لڑائیاں ہوئیں اور ہر بار صاحب خان کو شکست ہوئی۔ بار بار کی شکستوں سے دل تنگ ہو کر صاحب خان نے سردار مہاں سنگھ کو جھنگ پر حملہ کرنے کی دعوت دی اس کا خط اس کا ماموں عظمت کنجر لے کر مہاں سنگھ کے پاس گیا اور مہاں سنگھ نے حالات سے باخبر ہو کر جھنگ پر حملہ کرنے کا وعدہ کر لیا اور چند ماہ ہی میں فوج لے کر جھنگ پر حملہ آور ہوا۔ ان دنوں منڈھا گھر ایک اہم قلعہ تھا جس پر سلطان محمود کی حکومت تھی۔ مہاں سنگھ نے پہلا حملہ اسی قلعہ پر کیا۔ قلعدار مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور اس نے امان طلب کر لی۔ صاحب خان نے حکومت پر قبضہ کرنے کے

نے اپنے دماغ میں جو نقشہ مرتب کیا تھا وہ اس قسم کا تھا کہ ایک طرف مہاں سنگھ کا لشکر جھنگ میں لوٹ مار کرے گا اور دوسری طرف وہ خود داخلی بغاوت کر کے سلطان محمود کو شکست دے کر حکومت پر قبضہ کر لیگا ۔ اسی نقشہ کے مطابق مہاں سنگھ نے حملہ کیا تھا اور صاحب خاں نے شور کوٹ ۔ کچھی اور وچن میں بغاوت پھیلائی ۔ سلطان محمود اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوج لے کر کچھی روانہ ہوا اور کاروبار حکومت اس کی بیوی نعمت بی بی نے سنبھال لیا ۔ وہ خود سرکاری دفاتر کا معائنہ کرتی ۔ محاصل کا حساب کتاب دیکھتی اپنے خاوند کی فوجی ضروریات کی تکمیل کرتی اور خود مقدمات فیصل کرتی ۔ سیالوں میں وہ جہاندیدہ عورت تھی ۔

مہاں سنگھ کے لئے حملہ کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ریاست حکمران سے خالی تھی اور حکمران داخلی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا ظاہر ہے کہ اسے جھنگ پر قبضہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آ سکتی تھی اسی گمان کے تحت مہاں سنگھ نے جھنگ کے قریب دریائے چناب کے کنارے اپنی فوج اتار دی اور آس پاس کی بستیوں میں لوٹ مار شروع کی جس سے مسلمان سخت پریشان ہو گئے اور وہ نعمت بی بی کے پاس امداد کے طالب ہوئے ۔ اس بہادر خاتون نے ان لوگوں سے کہا کہ مہاں سنگھ کی فوج جلد یہاں سے چلی جائے گی تم اطمینان رکھو ، لوگ واپس چلے گئے ۔ نعمت بی بی مردانہ لباس پہن کر چند محافظین کے ساتھ مہاں سنگھ کے کیمپ میں جا پہنچی اس کے محافظوں نے یہ سمجھا کہ صاحب خاں کے مددگار مزید اطلاعات دینے آئے ہیں ۔

سکھوں کو اپنی قوت پر بڑا غرور تھا ۔ اور وہ شبہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ سلطان محمود کی رعایا کے مسلمان اس کے کیمپ میں داخل ہو سکتے ہیں ۔ نعمت بی بی جب مہاں سنگھ کے خیمہ میں پہنچی تو وہ اس وقت بیٹھا کوئی نقشہ دیکھ رہا تھا ۔ نعمت بی بی نے

اپنے محافظوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس سے گفتگو شروع کی۔

سردار جی آپ یہاں کیونکر آئے ؟

مجھے جھنگ کی مظلوم رعایا نے امداد کے لئے پکارا ہے اور میں ان کو ظالم سیال حکمران سے نجات دلانے کے لئے آیا ہوں۔

سیالوں میں کون سا حکمران ظالم ہے؟

سلطان محمود خاں۔

کیا آپ کو صاحب خان نے دعوت دی !

ہاں ۔

کیا آپ صاحب خان کو حق بجانب سمجھتے ہیں ؟

ہاں ۔

کیا صاحب خان کا رعایا پر اثر ہے ؟

مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اس کا اثر ہے یا نہیں ؛ آپ کس حیثیت سے سوال کر رہے ہیں۔

خالصہ جی سنئے میں سلطان محمود خان کی بیوی نعمت بی بی ہوں اور میں صرف چند محافظین کے ساتھ آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں کہ آپ ہمارے لئے مہمان کی سی حیثیت رکھتے ہیں اگر آپ بدنیتی سے آئے ہیں تو چلے جائیں کیونکہ میری رعایا تمہاری سلامتی کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرے گی اور اگر بھائی چارہ کے تحت آئے ہیں تو میں جھنگ کے تاج و تخت کی طرف سے میزبانی کا فرض ادا کرتے ہوئے یہ جوڑا پیش کرتی ہوں اسے قبول کرلیں اور اپنی فوج یہاں سے کسی دوسری جگہ لے جائیں۔

مجھے پرمیشر نے حکم دینے کے لئے پیدا کیا ہے کسی غیر کا حکم ماننے کے لئے نہیں میں جب تک چاہو یہاں رہوں گا اور کوئی طاقت مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتی

مہاں سنگھ کے اس جملہ پر نعمت بی بی کو غصّہ آگیا اور اس نے مہاں سنگھ کی ڈاڑھی پکڑ کر اس کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا اور تلوار میان سے نکال کر کہا "جس جگہ آپ بیٹھے ہیں یہ میری ریاست کا حصہ ہے اگر آپ یہاں سے نہیں جائیں گے تو پھر یہ تلوار فیصلہ کرے گی" یہ کہہ کر نعمت بی بی خیمہ سے باہر آگئی اور اپنے محافظین سے کہا کہ واپس چلو اسے سوچنے کی مہلت دے دو۔ تلوار کا فیصلہ چاہتا ہے یا بھائی چارہ کا

مہاں سنگھ نعمت بی بی کی اس حرکت سے غصّہ میں آگیا مگر اس نے قابو پاتے ہوئے کہا "اے عورت تم نے سفارتی آداب کا بھی احترام نہیں کیا لیکن اس کے باوجود میں اس نگری کو آج ہی چھوڑ دونگا اس لئے نہیں کہ مجھے تمہاری تلوار کا خوف ہے بلکہ اس لئے کہ تم عورت کے وجود میں ایک بہادر مرد ہو، اور میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں آج سے تم میری بہن کے برابر ہو۔ اپنے دل میں یہ خیال نہ رکھنا کہ میں تمہاری ریاستی طاقت سے خوفزدہ ہو کر جا رہا ہوں میں اگر چاہتا تو تجھے ابھی گرفتار کر کے جھنگ کے تخت پر قبضہ کر سکتا تھا لیکن تمہاری جرأت اور دلیری نے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا مگر یاد رکھو اس سرزمین پر میری نہ سہی مگر میری اولاد کی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ سردار مہاں سنگھ اپنے وعدہ کے مطابق صاحب خاں کا انتظار کئے بغیر جھنگ سے واپس چلا گیا۔ ایک بار سکھوں کی فوج ناکام ہوگئی۔ جب صاحب خاں کو اس واقعہ کی اطلاع ملی وہ سخت غضبناک ہوا۔ اس نے مہاں سنگھ کی طرف تیز رفتار قاصد دوڑائے اور واپس آنے کی درخواست کی لیکن مہاں سنگھ نے جواب دیا میں نے ایک عورت کو بہن سمجھ کر اس کی طرف سے زیادتی ہونے کے باوجود اس سے وعدہ کر لیا ہے اب میں تمہاری امداد نہیں کر سکتا تم بھائی بھائی آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لو لیکن یہ بات یاد رکھو جب تک نعمت بی بی ایسی بہادر اور سیاسی سوجھ بوجھ کی مالک کو ریاست کے انصرام پر قبضہ ہے تمہیں کامیابی نہیں ہوگی۔

صاحب خاں کے قاصد ناکام واپس آگئے۔ سلطان محمود خاں جو اس وقت دولو آنہ کے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا تمام حالات سے آگاہ ہو چکا تھا مگر وہ فوجی معاملات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ جھنگ کی طرف رخ نہ کر سکتا تھا۔ تاہم نعمت بی بی اس کی فوجی اور مالی ضروریات کما حقہٗ پوری کرتی رہی۔

صاحب خاں کو مہاں سنگھ کی باتوں کا احساس ہوا۔ اس نے سلطان محمود خاں کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے جھنگ کو خالی پا کر اس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس حملہ میں نعمت بی بی جو سلطان محمود خاں کی جگہ حکومت کر رہی تھی اور رعایا کو قابو کئے بیٹھی تھی کو قتل کر دیا جائے تاکہ سلطان محمود خاں کی کمر ٹوٹ جائے۔ بیوی کے قتل اور پایہ تخت پر قبضہ کے بعد وہ از خود شکست مان کر میرے حق میں دستبردار ہو جائے گا۔ چنانچہ ۱۲ شعبان ۱۲۰۴ھ بروز چہار شنبہ صاحب خاں نے اپنی مسلح افواج کے ذریعہ جھنگ پر اچانک حملہ کر دیا اور محل پر شب خون مار کر قبضہ کر لیا۔

نعمت بی بی اور دیوان بھوانی داس خفیہ راستہ سے موقع پا کر محل سے باہر نکل گئے لیکن ابھی فرار ہونے نہ پائے تھے کہ صاحب خان کے سپاہیوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ صاحب خان جب ان کی نعشوں کے پاس آیا تو نعمت بی بی کی نعش کو ٹھوکر مار کر کہا اسی عورت کو دلیر اور بہادر سمجھ کر مہاں سنگھ حملہ سے دستبردار ہوا تھا

صاحب خاں نے دوسرے روز دربار عام لگا کر اپنی تاجپوشی کا اعلان کر دیا۔

نعمت بی بی کی بہادری کے قصے آج بھی لوگ گیتوں میں فضا کی لہروں پر بکھرتے ہیں اور جھنگ کی عورتیں اس کی جرأت و دلیری پر ناز کرتی ہیں۔

شانتی اور نابو

۱۹۴۲ء

عشق سے پوچھے ذات" مشہور محاورہ ہے۔ عشق ایک ایسی الہامی کیفیت کا نام ہے جس کا اظہار زبان کے کسی بھی اسلوب اور انداز سے ممکن نہیں۔ عشق وہ جذبہ ہے جو انسان کی تمام صلاحیتوں۔ توانائیوں اور خوابیدہ قوتوں پر غالب آجاتا ہے اور عشق کے زخمی کا علاج کسی طبیب اور حکیم کے بس کی بات نہیں۔ عشق کی ابتدائی منزل مجازی اور انتہائی منزل حقیقی تصور ہوتی ہے لیکن اس کی ابتدائی منزل ہی اتنی کٹھن اور دشوار گزار ہے کہ طالب صادق ہی اس تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ عشق ہی تو ہے جس نے سسی کو تھلوں میں پیاس سے تڑپا تڑپا کر مار دیا اور یہ بھی عشق کی منزل ہے کہ مہینوال نے اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر مچھلی کی طرح پکایا اور اپنی سوہنی کی آرزو پوری کی اور یہ بھی عشق ہی ہے کہ مرزا نے کھیوہ خان کے محل سے صاحباں کو ایسے وقت اٹھایا جبکہ موت کے فرشتے اس کے اردگرد موجود تھے اور اسے بھی عشق کی منزل ہی کہا جائے گا کہ سسی نے مراد کے لئے گھر کا سکون تج دیا۔ انسانی معاشرہ میں کتنی کہانیاں روزانہ جنم لیتی ہیں اور کتنی کہانیوں کے عنوان تاریخ کی زینت بنتے ہیں یہ کہانی بھی اس سلسلہ کی کڑی ہے۔

جس طرح جرم گناہ کے لئے ذات۔ مذہب اور فرقہ کی تمیز قائم نہیں رہتی، اسی طرح عشق کا جذبہ بھی ان حد بندیوں سے ماورا ہے۔

شانتی موضع سیال کوٹ تحصیل شورکوٹ کے ایک زرگر کی بیٹی تھی۔ قدرت

نے اسے نسوانی حسن فیاضی سے عطا کیا تھا اس چھوٹے سے دیہات کے خس پوس جھونپڑوں میں اس نے جنم لیا۔ ٹھنڈے میٹھے اور گھنے درختوں کی چھاؤں میں اس کے حسن نے پرورش پائی۔ ستاروں کی روشنی اور چاند کی لہروں سے اس کے چہرے کے نقوش بنے۔ دو دریاؤں کی چھلوں نے اس کے سرو قد کی مستیاں دیکھیں۔ ہرے بھرے کھیتوں نے اس کے متوازن جسم کی سلوٹوں کا نظارہ کیا۔ ساون کی اودی۔ نیلی اور سیاہ گھٹاؤں نے اس کی پُرپیچ زلفوں کی تاب نہ لاکر پانی برسایا اور شفق کی لہروں نے اس کی مانگ سجائی۔ شانتی قدرت کا انمول حسن تھی اور اس کی جوانی میں اتنی تاب تھی کہ سرپٹ گھوڑوں کے شہسوار طنابیں کھینچنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس کی مست انگڑائیوں میں عشق کا سوز سلگتا تھا اور اس کی چشم آہو میں ٹیگور کی تصوراتی جھیل کا پرتو جھلکتا تھا۔ شانتی کا حسن غریب والدین کے لئے مصیبت بن گیا بقول شاعر ؎

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی

لیکن شانتی کے حسن و جمال یا اس کے دل و دماغ پر کسی بھی بری نظر کا اثر نہ ہوا۔ مگر وہ ایسی نگاہوں سے گھائل ہوئی جو اس کی طرف اٹھتیں اور پھر اس طرح بند ہو جاتیں جیسے وہ شانتی کے جمال کو پرنم پلکوں کے ذریعہ جذب کر رہی ہوں۔ شانتی ان نگاہوں کا دھڑکتے دل سے استقبال کرتی۔ وہ کون تھا؟

بستی کے کنوئیں کی گادھی پر بیٹھنے والا نوجوان نابو جس کا مضبوط جسم شانتی کی نظروں میں کھُب چکا تھا۔ نابو مسلمان تھا اور شانتی ہندو۔ دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے لیکن دو دل دریاؤں کے درمیان مذہب اور سوسائٹی کا بظاہر ناقابل عبور صحرا موجود تھا ایسا صحرا جس کے ذروں میں بستی کا تڑپتا خون جذب ہو چکا تھا ایسا پہاڑ حائل تھا

جسے فرہاد کا تیشہ بھی نہ کاٹ سکا تھا۔ ایسا گھرا جنگل بیلہ تھا جس میں مرزا کی لاش رُل گئی تھی۔ جس میں ہیر کی آرزؤں کا خون بہتا تھا اور جس میں سہتی کی مسکراہٹ ہوا ہو کا مرقد تھا۔ شانتی اور نابو کیسے عبور کر سکتے تھے؟ لیکن دونوں نے ان ہونی کو ممکن بنا دیا۔ دونوں اندھیری رات میں کنوئیں کی منڈیر کے نیچے ملے اور پھر کنوئیں کی گادھی ہمیشہ کے لئے نابو سے خالی ہو گئی اور رام دتہ زرگر کا گھر شانتی سے محروم ہو گیا۔ مذہب اور سوسائٹی کی بندشیں ٹوٹ گئیں، ہندو اور مسلمان کی تمیز ختم ہو گئی۔ انسان انسان سے مل گیا۔ آدمیت نے دونوں کو عشق کی گدڑی میں چھپا لیا۔ شانتی بھاگ گئی! آواز اٹھی، کس کے ساتھ! جواب ملا نابو زرگر بھی غائب ہے۔ دونوں گاؤں چھوڑ گئے مقدمہ درج ہو گیا۔ دونوں کی تلاش ہوئی مگر وہ ڈاکوؤں کی پناہ میں جا چکے تھے۔ پولیس کی مجال نہ تھی کہ وہ ڈاکوؤں کا تعاقب کرتی۔ وقت گزرتا گیا۔ شانتی مکمل ڈاکو بن گئی وہ بھی مردانہ لباس پہن کر وارداتوں میں حصہ لیتی معصوم حسن اب لوٹ مار کرنے لگا۔

ڈاکوؤں کے اس گروہ کا سرغنہ پنڈت سندر داس تھا جو چیلہ مندر مسن کی گدی سے تعلق رکھتا تھا لیکن مسلمانوں کی سوسائٹی میں رہ کر ان ہی جیسا بن چکا تھا اس نے اپنا نام غلام رکھ لیا تھا۔

موضع سیالکوٹ کے ایک ہندو گھرانے کی لڑکی سمترا کی شادی قصبہ بدھوانہ کے رئیس رام چند بترہ وکیل کے بھائی سے ہوئی تھی اور سمترا کو جہیز میں والدین نے جو طلائی بالیاں دیں ان میں ہیرے جڑے ہوئے تھے شانتی نے یہ بالیاں دیکھی تھیں اور اس کے دل میں خواہش تھی کہ اس کے پاس بھی اس جیسی بالیاں ہوں مگر اسے کہاں نصیب

شانتی نے اپنے سرگروہ سے کہا اگر تم مجھے بالیاں دینے کا وعدہ کرو تو میں ایک رئیس گھرانے کی مخبری کرتی ہوں جہاں سے وہ طلائی بالیاں اور ڈھیروں سونا ملے گا چنانچہ شانتی نے ایک مجذوب گداگر کا بہروپ بھرا اور قصبہ بدھوانہ میں بھیک مانگتے

ہوئے داخل ہو کر رام چند بترہ وکیل کی ڈیوڑھی میں صدا لگائی اور نحیف و نزار ہو کر دھڑام سے ڈیوڑھی میں گری۔ مکان کی عورتوں نے اس پر رحم کھایا اور اسے مکان کے اندر لے جا کر پانی پلایا۔ مگر وہ بظاہر بے ہوش پڑی مکان کا جائزہ لیتی رہی پھر سنبھلی اور چند منٹ گفتگو کر کے ان عورتوں کا شکریہ ادا کیا جن کی وجہ سے بھگوان نے اسے موت سے بچا لیا تھا۔ شانتی ان سے نقدی کی صورت میں دان لے کر دعائیں دیتے ہوئے مکان سے باہر نکل آئی اور اپنے ڈیرہ پر پہنچ گئی۔ بدھوانہ کا قصبہ جھنگ شورکوٹ روڈ پر نہر کے پل کے پاس جانب غرب آباد ہے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۴۲ء کو ابھی سورج غروب ہوا ہی تھا کہ مسلح ڈاکوؤں نے قصبہ میں داخل ہو کر فائرنگ شروع کر دی تاکہ لوگ خوفزدہ ہو کر گھروں میں چھپ جائیں پانچ ڈاکو رام چند کے مکان میں داخل ہوئے ان میں سے تین نے گھر کا قیمتی سامان سمیٹا اور دو مکان کی چھت پر فائرنگ کرتے رہے۔ ڈاکوؤں نے صندوقوں میں اور عورتوں کے گلے اور کانوں میں پہنے ہوئے تمام زیورات چھین لئے۔ ایک عورت جس کے کانوں میں طلائی بالیاں تھیں اس نے مزاحمت کی اسے گولی مار دی۔ پندرہ بیس منٹ میں رام چند کے گھر کا صفایا کر کے تمام ملزمان بڑھتی ہوئی تاریکی میں شورکوٹ کی طرف گھوڑیوں پر سوار بھاگ گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اہل دیہہ نے ان کا تعاقب کیا کچھ لوگ تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ان کے پیچھے مختلف راستوں پر دوڑے۔

بھنگو قصبہ کے پاس ایک نمبردار نے شبہ کی بنیاد پر ملزمان کو للکارا اور اپنی بندوق سے فائر کئے۔ ایک فائر ملزمان کی ایک گھوڑی کو لگا وہ زخمی ہو کر گری۔ ڈاکوؤں نے آگے بڑھ کر نمبردار کو قتل کر دیا اور اس کی گھوڑی چھین لی، فائرنگ کرتے ہوئے یہاں سے بھاگ نکلے۔ قصبہ ترکھانہ کے پاس نہر کے کنارے پٹواری نہر اور کچھ لوگ جمع تھے انہوں نے تیز رفتار سواروں کو آتے دیکھا۔ پٹواری نے شبہ محسوس کیا کہ یہ ڈاکو

ہیں اور اپنی بندوق تان لی ڈاکوؤں نے اسے گھیر کر نہر کے کنارے قتل کر دیا اور اس کی گھوڑی اپنے ساتھ بھگالی۔ اس طرح ملزمان نے بحفاظت قصبہ تلمبہ ضلع ملتان کے قریب جنگل میں رات بسر کی اور سامان آپس میں تقسیم کیا لوٹ کے اس سامان میں صرف سونے کے زیورات اور کرنسی نوٹ شامل تھے۔ شانتی کو اصل حصہ سے زائد اس کی خواہش اور وعدہ کے مطابق مطلوبہ بالیاں دے دی گئیں چونکہ کئی لاکھ روپیہ کا مال ان کے پاس تھا ان ڈاکوؤں نے (جن کے نام بعد میں پولیس رپورٹ میں درج ہوئے شانتی عرف ہرنی۔ پنڈت سندر داس عرف غلام۔ صلحا عرف صالح محمد کمہار۔ نابو عرف نوبہار رحاں جھبتہ) آئندہ کے لئے فیصلہ کیا اور حلف اٹھایا کہ کبھی واردات نہیں کریں گے اور آئندہ شریفانہ زندگی گزاریں گے۔ تلمبہ پہنچ کر ملزمان ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

شانتی اور نابو کے خلاف پولیس میں مقدمہ درج تھا لہٰذا دونوں اپنے گھر نہ جا سکتے تھے۔ یہ دونوں دہلی چلے گئے وہاں پہنچ کر کچھ عرصہ ہوٹل میں رہے لیکن یہاں ان کو اطمینان نہ تھا اس لئے کہ دونوں کی زبان خالص پنجابی تھی اور لباس بھی نہایت سادہ۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہوٹل میں دور نزدیک کے مسافر آ ٹھہرتے ہیں ممکن ہے ان کی شناخت ہو جائے چنانچہ وہ سردار دل جیت سنگھ کے پاس پہنچے جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کا ممبر تھا اور اس سے کہا کہ ہم پردیسی ہیں۔ نابو مالی کا کام جانتا ہے اسے اپنے بنگلہ میں مالی رکھ لیا جائے۔ سردار دل سنگھ نے ان سے کہا کہ وائسرائے کے بنگلہ میں ایک اچھے مالی کی ضرورت ہے میں تمہیں وہاں لگوا دوں گا۔ چنانچہ چند روز کے بعد نابو وائسرائیگل لاج میں بطور مالی ملازم ہو گیا اس طرح میاں بیوی آرام سے وقت گزارنے لگے، ۱۹۴۷ء میں لارڈ ویول وائسرائے ہند کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ پر لارڈ مونٹ بیٹن نے عہدہ سنبھالا۔ وائسرائے کے ملازمین نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں دونوں وائسرائے۔ ان کے خاندان کے افراد اور ملازمین کے بیوی بچے سب شامل تھے،

اس دعوت میں رام چند تبرہ کی لڑکی جو ایک اسسٹنٹ سے بیاہی ہوئی تھی بھی شریک ہوئی۔ اس موقع پر اس لڑکی نے شانتی کے کانوں میں طلائی بالیاں شناخت کر لیں لیکن زبان سے کوئی بات نہ کہی۔ دعوت کے تیسرے دن وائسرائے کی خصوصی اجازت سے دہلی پولیس نے شانتی اور نابو کو گرفتار کر لیا ان سے بالیاں برآمد ہو گئیں، دونوں اس غیر متوقع محاسبہ سے خوفزدہ ہو گئے۔ جھنگ پولیس اس چوری کا سراغ لگانے میں ناکام ہو چکی تھی اور مقدمہ تقریباً عدم پتہ کے خانہ میں درج ہو چکا تھا۔ اچانک دہلی پولیس دونوں کو لے کر جھنگ پہنچی۔

شانتی اس مقدمہ میں وعدہ معاف گواہ بن گئی پولیس نے مختلف مقامات پر دیگر ملزمان کو گرفتار کرنے کے لئے چھاپے مارے لیکن ناکام رہی۔ جب تک پورے ملزمان گرفتار نہ ہو جاتے مقدمہ کا مکمل چالان عدالت میں پیش نہ ہو سکتا تھا۔ ابھی ملزمان کی تلاش جاری تھی کہ ملک کے سیاسی حالات تبدیل ہو گئے پاکستان بن گیا غیر مسلم ترک سکونت کر کے ہندوستان چلے گئے۔ پولیس نے مدعی اور گواہوں کی غیر موجودگی کی بنا پر مقدمہ ختم کرنے کی درخواست عدالت میں پیش کی۔ کیپٹن سید حسنات احمد شاہ نے مقدمہ ڈسچارج کر دیا۔

عدالت نے شانتی کا بیان قلمبند کرتے ہوئے اس سے سوال کیا کہ تم غیر مسلم ہو کیا ہندوستان جانا چاہتی ہو۔ اس نے جواب دیا کہ کیا ابھی تک میں غیر مسلم ہی تصور ہوتی ہوں؟ میرا وطن یہی ہے اور میں یہیں رہوں گی۔ عدالت نے اسے نابو کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

کہانی لکھتے وقت دونوں کے بارے میں تحقیق کی گئی معلوم ہوا کہ وہ اس دنیا سے جا چکے ہیں ان کی صرف ایک لڑکی زندہ ہے اور اپنے گھر بار کی مالک ہے۔



میاں رحماں

سنہ ۱۸۹۶ء

رحمت علی عرف رحماں صرف ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ساٹھ برس کے سوزِ عشق کی ایک مکمل کتاب ہے جس کا ہر ورق اس کی حسرتوں سے مزین و منقش ہے رحمت علی کو جن لوگوں نے عالم جوانی میں دیکھا ہے وہ اس کے قد و قامت۔ حسین نقوش سے متاثر ہوتے بغیر نہ رہ سکے اور اس کے حسن خداداد کی تعریف و توصیف آج تک کر رہے ہیں۔ رحمت علی کا اصل وطن چک ۲۳؍ "نوناں دی بھٹیاں" ہے یہ چک چنیوٹ سے بذریعہ ریل چک جھمرہ لائلپور جاتے ہوئے چھوٹے سے ایک ریلوے اسٹیشن برج کے قریب ہے۔ رحمتؒ علی اسی چک کے ایک کمہار مسمیٰ "زیادہ" کے گھر سنہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا۔ والدین نے اس کا نام رحمت علی رکھا جو عرف عام میں رحماں مشہور ہو گیا۔

رحمت علی کے تین اور بھائی احمد، شیرا، محمد تھے۔ رحمت علی نہایت حسین و جمیل تھا۔ اس کے حسن کا شہرہ آس پاس کے دیہاتوں تک پھیلا ہوا تھا۔ دیہات کی دوشیزائیں اسے دیکھنے کے لئے بیقرار رہتی تھیں اور شرم و حیا کے تمام حجابات سمیٹ کر اس کا "دیدار" کیا کرتی تھیں۔ قدرت نے حسن کے ساتھ اسے آواز بھی عطا کی تھی اور آواز میں سوز کا جادو بھر دیا تھا۔ جب ابھی وہ پندرہ سولہ برس کا ہی تھا

تو وہ عشقیہ اور حزنیہ دوہڑے۔ ماہیے۔ کافیاں ترنم سے پڑھتا تو لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ رحمت علی کے حسن و دلفریب مترنم آواز اور دوشیزگان کے جھرمٹ دیکھ کر اس کے والدین نے محسوس کیا کہ کہیں غریب کا حسن اس کے گھر کو ہی برباد نہ کر دے انہوں نے رحمت علی کی اپنی برادری میں ہی ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کر دی۔ غریب والدین نے یہ سوچا کہ جوان لڑکا خراب نہ ہو جائے کیونکہ اس کے ارد گرد گاؤں کی مٹیارنوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔

رحمت علی کو جو زندگی کے اتار چڑھاؤ سے ابھی واقف نہیں تھا اپنی دلہن سے اس طرح محبت تھی جیسے شریف دیہاتی گھرانوں کی روایات ہیں۔ رحمت علی کے دو لڑکے بھی پیدا ہوتے اسے چونکہ ڈھولوں ماہیوں سے بڑی دلچسپی تھی ہر روز نئے نئے ماہیے یاد کرتا دور دور سے لکھوا کر لاتا پھر اس نے چمٹے پر دسترس حاصل کی یہ اس کا واحد ساز تھا جسے وہ ہاتھوں سے بجاتا اور زبان سے ماہیئے گاتا تھا اس کے ترنم اور سوز کی شہرت بڑھنی پھیلتی گئی پھر دیہات کے میلوں ٹھیلوں میں اسے خاص طور پر بلایا جانے لگا۔ ایک طرف کوئی تھیٹر ڈرامہ پیش کرتی دوسری طرف اکیلا رحمت علی اپنے چمٹے کے ساتھ ترنم چھیڑتا لوگ تھیٹر چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے۔

رحمت علی نے اپنا کام ترک کر دیا اور میلوں ٹھیلوں میں جا کر رقم کما لاتا اب اس کا یہی ذریعہ روزگار بن گیا تھا اس دوران رحمت علی میلہ سلطان باکھرہ دیکھنے کیلئے آیا یہاں اس نے اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا اور بہت داد پائی

اسی میلہ میں لال نامی ایک کمہار سے اس کی دوستی ہو گئی۔ لال کمہار نے رحمت علی کو میلہ صحابہ جو موضع صحابہ میں لگتا ہے دیکھنے کی دعوت دی۔ چند روز بعد لال اور رحمت علی میلہ صحابہ دیکھنے آ گئے۔ میلہ ختم ہو گیا مگر لال اور رحمت علی کی دوستی اس قدر پختہ ہو گئی کہ لال نے رحمت کو اپنے پاس مستقل ٹھہرا لیا۔ رحمت علی مٹی کے

برتن بنانے کا کام بخوبی جانتا تھا اس نے لال کی دوستی نبھانے کی خاطر وہ کام پھر شروع کر لیا وہ برتن بناتا لال کمہار اسے بھٹی میں پکا کر فروخت کیا کرتا۔ دونوں دن کو برتن بناتے اور شام ڈھلے موسیقی کی محفل جماتے۔

اسی گاؤں میں رحمت بی بی نام کی ایک جواں لڑکی جو لال کمہار ہی کے کسی عزیز کی بیٹی تھی سے رحمت علی کو محبت ہو گئی۔ رحمت بی بی کا قد چھوٹا تھا مگر حسین وجمیل تھی رحمت علی کا دل فریفتہ ہو گیا۔ دونوں کے درمیان ابتدا خاموش نگاہی نے گفتگو چھیڑی پھر دل کی بات زبان پر آگئی اور پھر دونوں گھل مل گئے رحمت علی اس کے عشق میں ایسا گم ہوا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی بچوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا اور اسی گاؤں کا ہو کر رہ گیا اب اسے برتن بنانے کی بھی ہوش نہ رہی وہ پہلے لوگوں کے لکھے ہوئے ڈھولے ماہیئے گاتا تھا مگر جب اپنے دل پر چوٹ لگی تو وجدان کے سوتے پھوٹ پڑے۔ شاعری کا القا ہونے لگا۔ جوں جوں رحماں کے دل میں رحمی کی محبت بڑھتی رہی۔ گاؤں کے لوگ اس کی مخالفت میں بڑھتے رہے رحمی کا گھر سے نکلنا بند کر دیا گیا۔ اب رحماں تارا دن بھری رات کھیتوں کے کنارے پٹے کی مسلسل آواز میں گم رہتا مگر رحمی اسے نہ ملتی۔ عشق نے وہ پیچ ڈالا کہ جو اس نے ترک کر دیا اور اک تارہ پر عشق شروع کر دی اس وقت یہی اک تارہ اس کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ جب دونوں کے عشق نے شہرت حاصل کی تو گاؤں کے لوگوں نے رحماں کو مجبور کر دیا کہ وہ یہاں سے چلا جائے لیکن وہ کس طرح جاتا اس نے جواب دیا کہ مجھے یہیں مار دو میری لاش کو اسی جگہ دفن کر دو میں اس مٹی میں مل جانا چاہتا ہوں۔

لال کمہار نے جب اس کی یہ کیفیت دیکھی تو اسے سمجھایا کہ ہم تجھے رحمی کا رشتہ دینے کو تیار ہیں اگر باقاعدہ طور پر تم اپنی برادری کو اس مقصد کے لئے یہاں لے آؤ رحماں اپنے اس دوست کے جھانسہ میں آگیا اور چاہ خیری والا کو چھوڑ کر اپنے رشتہ دار ول

کے پاس پہنچا اس کے کچھ رشتہ دار موضع پکے والا اور حبیب سلطان میں رہتے ہیں۔
اس نے اپنے چچا کو اس بات کے لئے مجبور کیا چنانچہ وہ برادری کے اور چند افراد کو لے
کر چاہ خیری والا پہنچے لال کمہار سے ملے۔ رحمی کے رشتہ کے لئے درخواست کی لیکن
گاؤں کے لوگوں نے ان کو جواب دے کر اپنے گاؤں سے نکال دیا جب یہ لوگ ناکام
واپس آئے تو رحماں نے پھر اس گاؤں جانے کی ٹھانی اور رات کے وقت گاؤں میں
داخل ہو گیا لوگوں نے صبح جب اسے دیکھا تو پکڑ کر بری طرح مارا پھر ہاتھ پاؤں باندھ
کر ایک سنسان مکان میں پھینک دیا۔ رحماں زخموں سے کراہ رہا تھا کہ علاقہ کے پٹواری
نے آواز سن لی اس نے قریب جا کر دیکھا تو رحماں تھا۔ پٹواری نے اس کی رسیاں
توڑ کر اسے آزاد کر دیا اور کہا اب اس طرف نہ آنا چنانچہ رحماں وہاں سے سیدھا تخت
ہزارہ پہنچا جہاں پیر راجہ شاہ سے بیعت کی اور جوگیانہ لباس پہنا اب رحماں جوگی تھا
شہروں شہروں پھرنے والا جوگی اکتارہ پر وہ اپنے ہی بنائے پنجابی بول ترنم سے الاپتا۔
جھومتا خود وجد میں آجاتا اور لوگوں کو متاثر کرتا۔ جوگی بنے ہوئے رحماں کو پچاس
برس ہو گئے۔ اس کی پہلی بیوی نے دوسری جگہ شادی کر لی تھی مگر وہ اس جہان سے رخصت
ہو چکی ہے اس کی محبوبہ رحمی کی بھی، والدین نے زبردستی کسی جگہ شادی کر دی مگر وہ بھی گھر
آباد نہ کر سکی اس کا خاوند مر گیا تو وہ بھی اب تک رحماں کی یاد میں بیوگی کی روائت نبھا
رہی ہے اس نے بھی جوگیانہ لباس اپنا جزو بنایا ہوا ہے اور رحماں کے بول الاپتی ہے۔
رحماں کی عمر اس وقت اسی سال کے قریب ہے آج کل اس کی صحت ختم ہو چکی ہے
وہ محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے جو جھنگ شہر کے قریب چاہ سنگیتا کے ایک بوسیدہ
مندر میں زندگی کے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا ہے وہ رحمی کے گاؤں کی طرف پاؤں
پھیلانا بھی گناہ سمجھتا ہے وہ ہماری لوک تہذیب کا ایک نمایاں ورق ہے اس نے پنجابی
شاعری کو اپنے سوز و ساز سے ایک نیا زاویہ دیا ہے۔